پہیلیاں

بدلیاں

سحاب قزلباش

ہندوستانی پبلشرز دہلی

طبع اوّل — دہلی پرنٹنگ پریس دہلی — مئی ۱۹۴۶ء

قیمت
عہ ر

۱۰

سول ایجنٹس

نگارستان ایجنسی اردو بازار دہلی

اپنی ... اپنا سر

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ سرخوش بھیا نے پورے ایک سال میں بدلیوں پر توجہ دی۔ اور یہ آسمانِ ادب پر چھائیں گی نہیں۔ بلکہ ان کے اودے نیلے سرمئی رنگوں کو دیکھ کر ادب کی مشہور و معروف بجلیاں قہقہے لگائیں گی۔ وہ دن دور نہیں جب وہ کوندکر بدلیوں کے باریک بچھوں سے جھانک جھانک کر تنقیدی اولے برسائیں گی یعنی دسر منڈاتے ہی اولے پڑینگے) اور پھر آسمانِ ادب سنہری روشنی سے جگمگاتا رہیگا۔ کسی کو محسوس بھی نہ ہوگا کہ ادبی نرم نرم روئی کے گالوں نے اتنے لمبے چوڑے آسمان پر چھا جانے کی کوشش کی تھی۔ مگر ان میں سے ٹھنڈی ٹھنڈی بوندیں نہیں گریں سوتے ہوئے بے خبروں پر یہ چھینٹیں نہیں دے سکیں تاکہ وہ چونک پڑتے اور اٹھنے کی کوشش کرتے۔ زمین ویسی ہی پیاسی ہے۔ پھر گل بوٹے کیسے نشو نما پائیں گے ——— اور ادب میں دلچسپی لینے والے کہیں گے۔ اجی کیا یہ ایک سال سے ہندستانی [illegible]

کاڈنکا پیٹ لیے تھے۔ محض بکواس کے سوا کچھ بھی تو نہیں۔ بیکار، کوئی کام کی بات نہیں۔ کہیں سیاہ چمکیلی آنکھیں ہیں۔ جو کبھی ہنستی ہیں تو کہیں روتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ کہیں گلابی خشک ہونٹ، کہیں زرد لمبی سی کانپتی ہوئی انگلیاں، کہیں گورے گورے گداز ہاتھ۔ فلمی گانوں سے بھرپور ——— کبھی چاندنی راتوں میں رو دیا جا رہا ہے تو ساون کی گھٹاؤں میں موسیقی میں سما گئے۔ انگوٹھیوں کی ادلا بدلی۔ زرد، سرخ چہروں کے اتار چڑھاؤ۔ دق کے ڈھانچوں میں رومان بندر پڑے نظر آتے ہیں، جن سے بو آ رہی ہے کہیں چوکلیٹ کھایا جا رہا ہے کھلونوں سے دل بہلایا جا رہا ہے۔ کہیں دیکھتے دیکھتے اسکول میں پہنچ گئے۔ بھئی یہ بھی عجیب مذاق سمجھ لیا لوگوں نے۔ افسانہ لکھنے اتنے آسان ہو گئے۔ کسی کی آنکھ دکھی۔ افسانہ لکھ مارا۔ ذرا نزلہ ہوا، تکلیف ہوئی چلو افسانہ لکھ رہے ہیں، یہ کیا۔ روزمرہ کی زندگی کی تصویر ہے بھائی۔ کوا چلا ہنس کی چال، محترمہ اپنی چال بھی بھول گئیں سحاب صاحب۔ لاحول ولا، کیا زمانہ آ گیا ہے۔ لو بھئی دو روپیہ پھینکا۔ آئے۔ یہ چھاپنے والے بھی کمانے کی نئی نئی ترکیبیں سوچتے ہیں۔ حقیقت ہے۔ یہ تو عام پڑھے لکھے لوگوں کی رائے ہو گی۔ ہمارے اس کرتوت کے متعلق مگر ان بڑی بڑی ہستیوں کی رائے بس کانپ جاتی ہوں یہ سوچ کر۔ بدلیاں پڑھنے کے بعد۔ تھوڑی بہت جو ملاقات ہے وہ بھی ہاتھ سے گئی۔ لوگوں پر خواہ مخواہ کا جو رعب تھا وہ تو گدھے کے سر سے سینگ والا حساب ہو جائے گا۔ کیا کروں ناحق سرخوش بیبیا کو اجازت دی۔ بابا جان کی روح کو الگ اذیت ہو گی۔ جب لوگ میرا مذاق اڑائیں گے یہ ہے آغا شاعر قزلباش مرحوم کی لڑکی کی لکھی ہوئی بکواس۔ نام ڈبویا اتنے بڑے لائق باپ کی لڑکی، اور یہ بکواس فرمائی۔ مگر سرخوش بیبیا نے وہ سبز سبز باغ دکھائے کہ عام لڑکیاں تمہارے ہی

جیسے افسانے لکھتی ہیں تم بھی چھپوا لو مجموعہ۔ اور اپنی پہلی کتاب کی خوشی میں اجازت دیدی۔ ویسی ہی بےچینی مجھے بھی ہو رہی تھی جیسے شوکت تھانوی صاحب کو اپنی پہلی کتاب میں محسوس ہوئی تھی۔ ان غریب کو کاتب کے بچوں کو بہلانا پڑا تھا کہ وہ باپ کو کام کرنے دیں۔ اور کبھی کبھی کاتب صاحب کے گھر کا سودا سلف بھی لائے مگر ہم بیچے رہے ان احسانوں سے جب ذرا انتظار کی شدت محسوس ہوتی تو ریڈیو کھول کر نئی کتابوں پر ریویو سننے لگتی۔ اور ڈر لگتے لگتا کہ وقار صاحب ہمیں بھی خوب ہی کھول کر صاف صاف سنائیں گے۔ اور پھر دعا مانگ لی کہ اسے خدا کچھ ایسا ہو کہ مسودے کھو جائیں اور یہ کتاب نہ چھپ سکے سب سے زیادہ بڑے بھائی جان نے ڈرا رکھا ہے۔ ان کے دن رات کے مذاق نے سانس روک لیا ہے۔ اور مجھے اپنی کتاب کے اس مقدمے کا خیال آگیا اسی وجہ سے میں نے کسی اور رسالے میں اپنے افسانے نہیں بھیجے۔ صرف چمنستان میں چھپے وہ بھی نہ جانے سرخوشی بھیا کو اور افسانے نہیں ملتے تھے جو وہ ہر مہینے میرے رجسٹروں سے تازہ لکھے ہوئے افسانے پھاڑ کر چپکے سے لے جاتے۔ اور جب میں سوچتی کہ فلاں جگہ یوں نہیں یوں لکھوں یا اس جگہ ہیروئن کو ہنسنے کے بجائے روٹھ جانا چاہیئے۔ اور میں اس ارادے سے رجسٹر کھول کر ٹھیک کرنے کی نیت سے دیکھتی تو وہاں پھٹے ہوئے ٹیڑھے اونچے نیچے کناروں کی صورت میں نظر آتے۔ پھر معلوم ہوتا کہ وہ تو اس مہینے کے چمنستان میں چھپنے گئے ہیں۔ بجھ کر رہ جاتی۔ ایک پرانے افسانے "نین ہین کو راہ دکھاؤ" کی کاپیاں پڑھ رہی تھی۔ جو بہت پرانا لکھا ہوا تھا۔
اب یاد بھی نہیں تھا۔ ہاں شاید جب لکھا تھا جب بھگت سورداس فلم آئی تھی۔ مجھے اس کا گانا بہت پسند آیا اور اس کو آخر میں نے اپنے افسانے کا عنوان رکھ لیا مگر مجھے

محسوس ہوا جیسے اس کے خیال کسی اور افسانے کے خیال سے ٹکرا گئے ہیں بہت سوچا تو یاد آیا کہ شاید اسی مہینے کے ہمایوں کے پرچے میں ناہید عالم کا افسانہ پھول کانٹے پڑھا۔ اب کیا کروں۔ بالکل وہی چیز ہے تھوڑا سا فرق۔ حیران تھی کہ ایک ہی خیال دو آدمیوں کے دماغ میں کیسے آیا ایک ہی تشبیہہ۔ پھر کچھ دن ہوئے میں نے چمنستان کا سالنامہ شائع ہونے سے پہلے 'بے بی' عنوان سے ایک افسانہ لکھا۔ مگر دم ہی تو نکل گیا کہ اتنی محنت بیکار ہوئی۔ یعنی شفیق الرحمن صاحب نے نجانے کہاں سے لکھ ڈالا۔ میرا بے بی افسانہ تو اس قدر ملتا ہے کہ نہ تو عنوان بدلتے بن پڑتی ہے نہ ماحول اور کردار تبدیل کر سکتی ہوں۔ چونکہ بدلیاں دیر میں شائع ہو رہی ہیں — مصیبت میری وہ پورا افسانہ۔ اب رجسٹر میں پڑا سو رہا ہے۔ کس وجہ سے کہ پڑھنے والے یہ تمیز نہ کر سکیں کہ یا تو بی سحاب نے شفیق الرحمان کا افسانہ پورا کا پورا چرایا ہی یا پھر انہوں نے کوشش کی مگر شفیق صاحب پرانے لکھنے والوں میں سے ہیں ان کو چور نہیں ٹھہرایا جاتا اور ہم رگڑے میں آ جاتے۔ لہٰذا خیریت اسی میں سمجھی کہ اُسے رجسٹر میں ہی دفن کر دیں۔ خیر میں کہاں سے کہاں آ گئی۔ مطلب یہ تھا کہ میں نے افسانے اس لئے نہیں لکھنے شروع کئے کہ کتابیں چھپیں نام مشہور ہو۔ یا رسالے میں نام چھپے۔ اور اس کی خواہش ہو کہ اڈیٹر صاحبان افسانے کے اوپر اپنے خوشامدی جذبے سے قلم کو حرکت دیں کہ فلاں مشہور و معروف محترمہ کا افسانہ، فن کے لحاظ سے چوٹی کا افسانہ ہے یا اور اسی قسم کے الفاظ لکھے جائیں۔ مگر جناب 'من خوب می شناسم' اور ضمیر پہلی کی صورت میں بول اٹھتا ہے کہ "ابھی تو ات نا پانی ہے" اور شرمندہ ہو کر اپنے ٹخنوں تک کہ پانی میں ادیبوں کے ٹوٹے ہوئے قلم اٹھا اٹھا کر غور سے دیکھنے لگتی ہوں۔

کیونکہ بھائی جان نے کہا تھا۔ اور ڈاکٹر رشید جہاں نے بھی باتوں میں مجھے سنا دیا
تھا کہ آجکل کی لڑکیاں اٹھیں بھاگیں اور افسانے لکھنے بیٹھ گئیں۔ بھئی بڑے بڑے لوگوں
کی کتابوں کا مطالعہ کرو۔ پڑھتے پڑھتے تم ایسا محسوس کرو گی کہ تمہارا دماغ اپنی جگہ
بڑھتا جا رہا ہے۔ آگے کو سرکتا جاتا ہے۔ اور میں پھر نئی نئی کتابیں پڑھنے لگتی۔ سمجھنے
کی کوشش کرتی۔ یہاں تک کہ کافی کتابیں پڑھ ڈالیں مگر بے سود ــــــ جب
گھٹائیں چھا گئیں پھوار پڑنے لگی۔ یا بارش بند ہوئی سبزا نہا دھو پھولوں کا سنگھار کر کے
اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی آنکھوں سے مجھے اشارے کرنے لگا۔ دل میں ایک قسم کی خوشی کی
گدگداہٹ سی محسوس ہوئی اور میں نے قلم اٹھایا۔ لکھا اور پھینک دیا۔ گویا جوش اٹھا
امنگوں سے بھرا دل دھڑکا۔ اور دو ہی بار کو چند سطریں لکھکر اتار دیا۔ اور زندگی کو
تھوڑی دیر کے لئے سکون مل گیا۔ اداس شام آئی سوگوار سی۔ اور افسردہ چہرے پر
سیاہ نقاب ڈال کر سسکیاں بھرتی ہوئی ادھر ہی مڑ گئی جدھر سے آئی تھی مگر دنیا
اسی طرح محو تھی اپنے کھیلوں میں۔ مگر میں ہر شام کو اس کا زرد اداس چہرہ بڑے
غور سے دیکھتی ہوں۔ ہواؤں میں ملی ہوئی اس کی سسکیاں میرے کان سنتے ہیں
یہاں تک کہ وہ سیاہ ملگجی سی چادر کا نقاب منہ پر ڈال کر ادھر ہی مڑ جاتی ہے، جانور
پرندے تیزی سے بڑھے چلے جاتے ہیں۔ ہر شام کتنی افسردہ و سوگوار ہوتی ہے جیسے
سارے جہان میں جنازے ہی جنازے پڑے ہیں بے گور و کفن اور شام دبے دبے
قدموں سے آتی ہے پرسا دیتی ہے اور واپس مڑ جاتی ہے۔ مجھے جوش چچا کا وہ فقرہ یاد
آجاتا ہے۔ جب انہوں نے کہا تھا۔ "تم نے کبھی محسوس کیا ہے کہ شام اتنی اداس کیوں
ہوتی ہے۔ مگر میں کچھ نہ بول سکی۔ میں نے نہیں کہدیا۔ انہوں نے افسردہ سا

چہرہ بناتے ہوئے کہا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ واقعی وہ تکلیف محسوس کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا۔ دنیا کی ہزاروں بیواؤں اور یتیموں کی آہوں کا اثر ہوتا ہے۔ جو شام اتنی افسردہ اور آسمان سیاہ سا ہونے لگتا ہے۔ وہ آہیں ٹکراتی ہیں آسمان سے ——— مگر ان کا خدا ——— بڑا سوتا رہتا ہے ——— اتنی افسردہ غمگین حقیقت پہ میرے آنسو آ گئے اور سردی لگنے لگی مگر ان کے اس آخری فقرے پر میں بے اختیار ہنس دی جیسے شام سے صبح ہو گئی ——— وہ مسکرائے۔ کیوں؟ اور میں نے بھائی صاحب کی طرف دیکھ کر کہا اور آپ کے خدا کو احساس ہے اس کا۔ انہوں نے پان کھاتے ہوئے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ہاں۔ اور ان کی ہاں کرتے ہیں کچھ لمحے کے لئے گونجتی رہی بھائی جان ہنس رہے تھے۔ اور میں یہ سوچ رہی تھی۔ کہ انہوں نے زور سے مسکراتے ہوئے کہا ——— بیٹی۔ ہمارا خدا بہت بڑا ہے۔ اور اکثر تنہائی میں ہم سے سب حال کہہ ڈالتا ہے۔ اور وہ نجانے کیا کیا کہہ رہے تھے جیسے ایک بچہ اپنے کھلونے کی تعریف میں دوسروں کے کھلونوں کی توہین میں باتیں بنا رہا ہو ——— اور میں سوچ رہی تھی کتنے بڑے دماغ کا شاعر۔ ننھے منھے سے بچے میں کتنی جلدی تبدیل ہو گیا ہے معصوم سی باتیں، فرشتوں جیسی مسکراہٹ ——— ایسے میں جی چاہا کہ کچھ کہہ ڈالوں ——— کہ یکایک بدلیاں یاد آ گئیں۔ کہ تم نے بھی تو بچوں کی دنیا کی سیر لکھی ہے، افسانوں کے پلاٹ کی دیواریں بچوں کی زبان نے تیار کیں۔ رنگ کے برش لیکر جلدی میں ننھے ننھے ہاتھوں سے بھدا سا رنگ پھیر دیا۔ کردار بچوں جیسے۔ اور بس یہی کیا۔ خیر اب جو مرضی آئے دنیا کہے مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ ریڈیو اسٹیشن میں تین سال رہ کر اپنے ہمدرد دوستوں عزیزوں کی کم باتیں سنی ہیں جو اب اس کتاب کے بارے میں سنتے ہوئے خودداری کو ٹھیس لگنے گی، اسے

جناب ہم تو من موجی ہیں۔ جب جی چاہا دل خوش کرنے کے لئے لکھ مارا۔ مجھے کیا غرض یہاں سے کسی نے کہا دیباچہ فلاں سے لکھواؤ۔ فلاں کے لکھنے سے سیل بہت ہوگی۔ اور مجھے یاد آ گیا کہ کتاب میں کچھ نہیں ہے۔ فلاں کے لکھنے سے سیل ہو جائے گی۔ بالکل اس طرح جیسے ایک مشہور شاعر، لاہور میں کسی جگہ اپنا کلام اپنی مدھ بھری آواز میں سنا رہے تھے۔ جب وہ ختم کر چکے تو سامعین میں سے ایک صاحب نے بے حد تعریف کرتے ہوئے کہا "واہ جی۔ تھوا ڈے کی کہنے اے۔ میں کہیا جی خوب گا وندے او۔ ایک ہور چیز گا دیو" (یعنی واہ جی آپ کے کیا کہنے ہیں۔ میں نے کہا جی خوب گاتے ہو، ایک اور کوئی چیز گا دیجئے۔ اب آپ ہی غور کیجئے کیا گزری ہوگی ان پر۔ دماغ سے نکلے ہوئے اشعار کچھ نہیں تھے۔ ان بھائی کے لئے صرف گانے کی تعریف کی تھی۔ میں نے بھی سوچا کہ چلو کتاب میں تو بکواس ہے، لاؤ کسی مشہور ہستی سے دیباچہ ہی لکھوا لیں، تاکہ بھئی کاغذ کتابت اور پریس کی چھپائی ہی کے پیسے نکل آئیں۔ مگر۔۔۔ کبھی شاید باباجان نے گنگھی اپنے ہاتھ سے دی تھی۔ اور ان کی عادت تھی کہ لفظ خوشامد سے اتنی نفرت تھی جتنی آجکل مجھے ہے ——— سوچ سمجھ کر ہم نے ہی لکھنا شروع کیا۔ مگر صاحب "این کتاب ہمہ آفتاب است" والا معاملہ ہے افسانے اس سے بڑھ چڑھ کر اور اب جو اپنے لکھے ہوئے کو پڑھا تو بے اختیار جھنجھلا کر کے پھینک دیا ——— آج دوسرا روز ہے اسے لکھے ہوئے اور یہ میری قابلیت پر آنسو بہاتا ہوا پریس میں جا رہا ہے۔ اب آپ کی جو مرضی میں آئے کہیے۔ ہاں! اپنے مشفق باباجان کی روح کی نذر کرتی ہوں۔ اس کتاب کو۔ کیونکہ سب سے بڑی وجہ یہی ہے میرے افسانے لکھنے کی شعر کہنے چھوڑ دیئے۔ بہت کم کہتی ہوں۔ اور باباجان نے مجھے لفظوں میں کہا تھا کہ بیٹیا! قدرت نے تم پر ظلم کیا کہ تم کو لڑکی بنایا۔ اے کاش میرے پاس جہاں تین لڑکے ہیں

تم بھی لڑکا ہوتیں۔ تو میری روح بے چین نہ رہتی۔ اور پھر لڑکی ہو کر تمہاری ذہنیت
تمہارے خیالات سب کچھ لڑکوں جیسے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جب میں گیارہ
سال کی تھی۔ بابا جان تندرست تھے۔ صبح شام میں ان کے ساتھ سیر کرنے جایا کرتی
تھی۔ وہ مجھے ہر وقت سمجھایا کرتے تھے کہ بیٹا دنیا بڑی خراب جگہ ہے۔ یہاں اپنا عزیز کوئی
نہیں۔ یہاں تک کہ ماں باپ بھی اپنے نہیں ہوتے بیٹا۔ جتنے تلخ تجربے مجھے ہوئے ہیں۔
خدا تمہیں بچائے رکھے۔ نکلسن باغ میں وہ سرخ پھولوں کا درخت اب بھی ہے، جہاں
بابا جان اور میں صبح و شام گھنٹوں بیٹھے رہتے تھے۔ جب اٹھتے تو وہ ایک پھولوں کا
گچھا اپنے ہاتھ سے توڑ کر مجھے دیتے تھے۔ اور میں گھر آکر گلدان میں لگا دیتی تھی۔ اب
بھی امی جان اور بھائی صاحب کے ساتھ صبح کو سیر کو جاتی ہوں اور وہی درخت دور سے
نظر آجاتا ہے۔ جس کی نرم نرم شاخوں کے سائے تلے۔ سفید ململ کا کرتا پہنے۔ نرم نرم
ہاتھوں سے میرے ہاتھ پکڑے ہوئے بابا جان کتنے ہی قصے سنایا کرتے تھے۔ داغ
صاحب قبلہ کی روح کے لئے وہ میرے ہاتھ بھی آسمان کی طرف اٹھانے کو کہتے اور
میں بھی بابا جان کے ساتھ فاتحہ پڑھتی تھی۔ کس قدر عقیدت تھی بابا جان کو اپنے استاد
سے۔ مگر عین اسی وقت اسی سرخ پھولوں والے درخت کے نیچے میں بھی اپنے پیارے
عزیز محبت بھرے دل کے مالک باپ کے لئے فاتحہ پڑھتی ہوں۔ ان کے انتقال کے
بعد مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اب میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ مگر ہائے یہ انسان
کس قدر معصوم بچہ ہے۔ کہ کتنی جلدی اپنے کھلونوں میں غرق ہو جاتا ہے۔ اور مشیت ایک
عقلمند ماں کی طرح نئے نئے خوبصورت کھلونے اپنے آزردہ بچے کے سامنے ڈال دیتی ہے۔ اور وہ ان
کھلونوں کی رنگینی میں غرق ہو جاتا اور سب کچھ بھول کر" کس قدر عجیب ہے یہ دنیا اور اس کی محبت اور یہ!"

بدلیاں

آہ آج نہ جانے میرا دل کیوں اس قدر اُداس ہے۔ شائد موسم کی وجہ سے
شام کی چائے پر سب میرا انتظار کر رہے ہیں۔ کئی دفعہ شاہین بھی آئی ——
تو یہ کس قدر شریر لڑکی ہے۔ میرے کان میں چپکے سے آکر اس قدر زور سے
چیخی کہ میرا بے قرار دل۔ دھڑکتے دھڑکتے بے اختیار تڑپ گیا —— اور وہ
تھی کہ دوڑ کر اپنے مٹی میں بھرے ہوئے جوتوں سمیت میرے نرم نرم سفید سفید
بستر پر چڑھ گئی —— اور اپنے چھوٹے چھوٹے خوبصورت ہاتھوں سے
میرے پریشان بالوں میں اپنا دو گز لمبا فراک کا رِبن نکال کر باندھنے لگی ——
چھوٹی لو جی باجی۔ آپ تو بلی گندی ہو گئی ہیں —— ایسے اچھے بال،
جس میں ربن بھی نہیں باندھتی —— چلئے اب تو آپ تیار ہو گئیں۔ اب

چلئے بھی چائے پڑا امی کہتی ہیں آج بھیا جانی، بلی اچھی مٹھائی لائے ہیں۔ بھیا جانی بھی آپ کو بلا رہے ہیں۔ اور مجھے یہ چوکلیٹ دیئے ہیں۔ چلئے بھی لوحی باجی ——۔ پاپا کہتے تھے تمہاری لوحی باجی اپنے کمرے میں پڑھ رہی ہیں —— تم بلا لاؤ۔ پڑھنے کا لفظ سن کر مجھے ذرا ہوش آیا۔ پلنگ پر منٹو کے افسانے بُری طرح کروٹیں بدل رہے تھے، میں نے اسی کو غنیمت سمجھا۔ اور شاہین کو پیار کرتے ہوئے۔ اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ سیاہ گھنے تراشے ہوئے بالوں میں سفید باریک سی مانگ، چمکدار پیشانی، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جو حیرت سے میری غمگین آنکھوں میں چمکیلے پانی میں تڑپتی آرزوؤں کو سمجھنے کی ناحق کوشش کر رہی تھیں۔ گلابی پتلے پتلے ہونٹ جو حیرت سے دائرے کی شکل میں تبدیل ہو گئے تھے۔ گرم گرم گلابی رخسار کتنی ٹھنڈک ملتی تھی۔ اختر بھیا میں، نہ جانے کیوں میرا جی چاہتا کہ انہیں کو دیکھے جاؤں اسی طرح سینے سے لگائے۔ ہر وقت اختر سے زیادہ مجھے شاہین کا خیال رہتا بازار جاؤں تو شاہین کے لئے کوئی نہ کوئی چیز لاتی، کھانا بغیر شاہین کے میں نہ کھا سکتی۔ شاہین کے چوکلیٹ خریدتے خریدتے دوکاندار سے کچھ دوستی بھی پیدا ہو گئی تھی۔ دوکان میں گھستے ہی وہ مسکرانے لگتا۔ بیوقوف مرد۔ بالکل اختر جیسا۔ مگر وہ بیوقوف تو نہ تھا۔ نہ جانے ہیں تو ابتک اس کی عادت نہ سمجھی۔ نہ جانے کب تک ایسے ہی گمراہی میں دن گذریں گے کئی دفعہ ثریا نے بھی پوچھا "ارے غضب روحی تم کتنی خوش نصیب لڑکی ہو۔ ہر مرد تمہارے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ بھئی عجیب لڑکی ہو۔ مجھے تو تم سے رشک پیدا ہو گیا تمہارا یہ کزن، کتنا خوبصورت ہے، وہ کتنا پسند کرتا ہے تم کو اور سچ پوچھو تو ہم نے یعنی ناہید، نزہت، انجم نے کئی دفعہ، کافی ہاؤس میں اس کی میز کے سامنے

بیٹھنے کی کوشش کی۔ مگر ایکبار دیکھنے کے بعد وہ اسیطرح کافی کے کپ کے کپ خالی کئے، سگریٹ
پیتا رہا ــــ کس غضب کی اس کی نگاہیں ہیں۔ سیاہ بڑی بڑی چمکدار جس کی پتلیوں میں سگریٹ
کے پیچدار دھوئیں میں شائد تم ناچتی رہتی ہو۔ فلاسفر ہے فلاسفر، لڑکی یوآر ویری لکی۔ اور مجھے
مجبوراً مسکرانا پڑتا۔ ادھر وہ بیچاریاں کیا جانیں یہ مرد کتنی ایکٹنگ کرتے ہیں یہ پیدائشی ایکٹر
ہوتے ہیں آنکھ کھولتے ہی نہ جانے کتنے ڈراموں میں پارٹ کر چکتے ہیں ہر بار نئے روپ میں
. . . . زور سے گھنٹی بجی، نیلا پردہ کچھ سٹر ماکر سکڑ گیا۔ اور ایک چمکتا ہوا شاہین
جیسا چہرہ مسکراتا ہوا نظر آیا۔ ہاؤ ڈو یو ڈو۔ روحی ــــــــ اوہ!
آئی ایم لوکنگ سو سویٹ۔ وائی۔ اور مسکراتی ہوئی سیاہ بڑی بڑی شریر
آنکھیں میری اداس آنکھوں میں جواب ڈھونڈ رہی تھیں۔ ادھر میں نے طبیعت سے
مجبور ہو کر کھڑکی سے جھانکنا شروع کر دیا۔ میں نگاہوں کی سیاہی ان کا چمکیلا پن اودی
اودی بدلیوں میں۔ مٹا دینا چاہتی تھی۔ آہ! کتنا اداس دن تھا۔ ہر چیز اداس نظر آتی تھی۔ ہوا
سرد آہیں بھرتی ہوئی مجھے کچھ سنانا چاہتی تھی۔ شاید کسی اجڑے گھر کی داستان۔ مگر
اس کے سانس کی گرمی صرف رخسار ہی محسوس کرتے تھے وہ آگے کچھ بھی نہ کہہ سکی۔
میری طرح مجبور ہر آزاد چیز جسے دنیا آزاد سمجھتی ہے۔ کتنی مجبور ہوتی ہے۔ مجبور بے بس
بالکل ایسے جیسے ایک ہرے بھرے گلزار میں ایک پر قینچ پرند۔ جو موسم بہار میں، سرسبز
دنیا سے تنگ آکر آسمانی فضاؤں میں اودی اودی مٹیالی سی بدلیوں میں، نرم نرم روئی
کے گالوں میں۔ اپنے بوجھل جسم کو چھوڑ دے اور بہتا ہی جائے ــــــ جیسے ایک

زخمی پرندہ جس میں جان ہو، مگر بے حس سا، میری آنکھیں جلنے لگیں۔ سر چکرانے لگا۔
انگلیاں کانپنے لگیں۔ رنگ کتنا زرد ہو گیا تھا۔ میری آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں، مجھے
ایسا محسوس ہوا جیسے میرے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا۔ ایک دفعہ
ہی دل گھبرانے لگا۔ مجھے پسینہ آنے لگا۔ پھر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکو سنے میری
آنکھیں کھول دیں۔ آسمان کتنا گہرا اودا مٹیالا سا ہو گیا تھا۔ اتنا سیاہ جیسے ہزاروں
چیلیں اڑ رہی ہوں۔ ان کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ میرا دل محسوس کر رہا تھا، سیاہ
اودے سے آسمان میں میری روح سما جانا چاہتی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے جینے کی
تمنا نہیں۔ میں کبھی زندہ رہنا نہیں چاہتی۔ مجھے سب سے نفرت ہے۔ کبھی کبھی ایسا
محسوس ہوتا ہے۔ جب میں تنہائی میں لمبے چوڑے مٹیالے سے اودے اودے
آسمان کو گھورتے گھورتے تھک جاتی ہوں تو۔ ایسا محسوس ہوتا ہے . . . . .
جیسے . . . . . . جیسے میری روح نرم نرم بادلوں میں سما جانا چاہتی ہے میرا جی
چاہتا ہے۔ یا تو میں اُن چھوٹے چھوٹے روئی کے گالوں کو اپنی مٹھیوں میں لے کر
بھینچ ڈالوں یا وہ خود مجھے آ کر گھیر لیں۔ پھر میں کبھی بھی کسی چیز کو نہ دیکھ سکوں گی۔ میری
بصارت میرا ساتھ چھوڑ دے گی۔ مجھے دنیا کی خوبصورت چیزوں سے نفرت ہو جائے گی
مجھے کسی چیز میں امتیاز نہ ہو گا۔ میں سب کو دیکھ سکوں اور مجھے کوئی بھی نہ محسوس کر سکے
میری روح بے چین ہے۔ شاید کبھی اس کو سکون حاصل ہو۔ مجھے کتنی راحت ہوتی ہے
جب کسی کی روح الجھنوں سے تنگ آ کر بھاگ جائے۔ تب دنیا والے کتنی آہ!

زاری کرتے ہیں۔ انہیں کتنا افسوس ہوتا ہے کہ ہم ابھی مبتلا ہیں ذہنی کشمکش میں، مگر
یہ روح آنا دہو گئی؛ اور اسی رشک میں اس کے جسم کو کتنی اذیت پہنچانے کی کوشش
کرتے ہیں، ہزاروں طریقوں سے بھاگی ہوئی روح کو بہلا پھسلا کر بلانا چاہتے ہیں؛ اور
روٹی کے چند ٹکڑوں سے، اور خود ہی کھا جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی معصوم
بھوکے بچے کو روٹی کا ٹکڑا دکھا کر جب وہ قریب آنے کی کوشش کرے تو منہ چڑا کر
خود کھا جائے۔ کتنے فریبی ہیں یہ لوگ، اُف اللہ۔ مجھے رونا آنے لگا۔ میرا جی چاہا خوب زور
زور سے چیخیں مار مار کر روؤں۔ چمکیلی نگاہوں نے دوسرا حربہ استعمال کیا۔ نیلا پردہ کچھ
کسمسایا۔ اور ریڈیو کی (valuyom) تیز کر دی گئی۔ من کی جیت کا یہ ریکارڈ کمبخت
ریڈیو والوں کو بھی اسی وقت بجانا تھا: "نگری میری کب تک یونہی برباد رہی گی ——
دنیا۔ دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی —— یہ ریڈیو بھی عجیب مصیبت ہے۔
جذبات سے لبریز، ایک سخت لکڑی کا ڈبہ جو مصنوعی روشنی کا مالک مگر گول گول سے
پینچ کو موڑ دینے سے لچکدار آوازیں۔ سروں میں ڈوبی ہوئی تانیں۔ سرد آہیں، قہقہے، سب
ہی کچھ ہے اس چھوٹی سی دنیا میں، ہم بھی کتنے خود غرض ہیں کس شوق سے دوسرے کی
دنیا کی سیر کر لیتے ہیں۔ اس کی ہر بات سے ہم واقف، یہاں تک کے راز و نیاز میں بھی مخل
اور پھر تحقگی یہ کہ اگر کان گنہگار ہوتے، تو یہ ان کے شریر دلوں کی شرارت۔ مگر اس کا جتانا وہ
بھی تحریر میں۔ کتنے غیرت دار ہیں یہ لوگ —— کسی کو کیا معلوم ان کی دنیا کتنی تاریک
ہے —— کتنی خوفناک مگر دنیا کی نظروں سے کوئی دیکھے۔ رنگین پردوں میں ناچتی

ہوئی مسکراتی ہوئی تصویریں۔ سب محو ہیں۔ بیخودی کی کوئی کیا جانے۔ اس درد کو۔۔۔
میرے دل میں ایسی چبھن سی ہونے لگی جیسے کسی کی تیز نوکیلی پلکیں نرم نرم سے رخساروں سے
ٹکرا جائیں —— شاہین کی کتنی لمبی لمبی نوکیلی سیاہ پلکیں ہیں۔ چمکدار —— سیاہ
مجھے کتنی خواہش ہے کہ وہ روئے کبھی روئے اور اس کی سیاہ چمکیلی پلکوں پر سفید سفید
موتی جیسے آنسو یونہی سے ٹھہر جائیں —— اے کاش وہ کبھی روتی —— مگر کیا
اسے کبھی رونا نہیں آئے گا —— ہر وقت ہنسنا۔ کبھی کبھی تو رونا بھی چاہیئے۔
اگر امی یہ باتیں سن لیں۔ لڑکی کیا دیوانی ہوئی ہے، ایسی منحوس باتیں مجھے پسند نہیں۔
خدا نہ کرے میری شاہین روئے۔ اور پھر جذبۂ محبت سے مغلوب ہو کر اس کو زور سے
بھینچیں کہ شاہین کا منہ سرخ ہو جائے۔ اس کا سانس گھٹنے لگے۔ اور —— اور
سرخ سرخ ہونٹ کانپنے لگیں اور پھر میں —— اچھل پڑوں —— میری
تمنا جاگ اٹھے —— میں اتنے زور سے قہقہہ لگاؤں کہ امی اپنی گرفت
ڈھیلی کر دیں۔ اور شاہین کے گول گول شانوں کو بے اختیار ہلا ڈالیں، اف لڑکی تم کو
کیا ہوا دیوانی تو نہیں ہو گئی۔ اور حیرت سے ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں۔ اور
شاہین کا نچلا ہونٹ اپنے ساتھی سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اور سیاہ چمکیلی
نوکیلی پلکوں پر دو بے قرار آنسو کانپتے نظر آ جائیں سیاہ چمکیلی حیران نگاہیں
شاید پھر میری اداس نگاہوں کی داستان پڑھ سکیں۔ اور میں پلٹ کر دیکھوں تو
دریچے کے باہر سیاہ دھندلے سے آسمان سے بھی ہزاروں آنسو تڑپ تڑپ کر

ماں کی گود میں گر رہے ہوں اور پھر نیلا پردہ ایک آہ بھر کر منہ پھیرے اور اس کی اوٹ میں سے چمکتا ہوا چہرہ جو آنسوؤں سے تر ہو۔ اور سیاہ چمکیلا چشمہ ابل پڑے، ساری دنیا رو دے اور پھر میں بھیگی ہوئی پلکوں کی ٹھنڈک سے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں کو ٹھنڈا کر سکوں۔ مجھے کتنی خوشی حاصل ہو گی۔ کتنا سکون میری زندگی میں پیدا ہو جائے گا مگر یہ اودی اودی بدلیاں، جن کی نس نس میں ان روئی کے گالوں میں کتنا میٹھا میٹھا رس ہوگا ———— آہ میرے خشک ہونٹ اب پیاس سی محسوس کر رہے ہیں ———— اے کاش میری بے قرار روح ان، اُداس اُداس سے سہمے، اودی اودی بدلیوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھو جائے اور پھر میں بھی کبھی شاید کسی کو اتنی یاد آسکوں۔ میرے عزیز چھوٹے چھوٹے بچوں کو انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کر کے بتائیں، تمہاری فلاں فلاں عزیز ان بدلیوں کے پیچھے غائب ہے اور پھر ننھے ننھے ہاتھ مجبوراً آسمان کی طرف بڑھا دیئے جائیں۔ اف یہ پھر یہ لوگ بیکار سے روئی کے گالوں ٹمیالی سی بدلیوں سے کسی چیز کی بھیک مانگتے ہیں آہ یہ اودی اودی بدلیاں میری روح پر چھا جائیں یا میں خود اُن میں سما جاؤں، دور آسمانی فضاؤں میں جہاں میں اتنے قریب سے سیاہ آنکھوں کی چمک دیکھ کر گھبرا نہ جاؤں جہاں گیلے گیلے کانپتے ہونٹ مجھ سے کچھ بھی نہ کہہ سکیں ———— اور میرے چاروں طرف ایک نیلا پردہ رقص کرتا رہے۔ باریک نیلا ٹمیالا سا کچھ اودا اودا سا سیاہ پردہ ———— جہاں سے میں ہر چیز کو دیکھ سکوں اور مجھے کوئی بھی نہ دیکھ سکے

میں خود مجسم بدلی بن جاؤں۔ جہاں جی چاہے نرم نرم روئی کے گالوں میں لڑھکتی ہوئی۔ کبھی کھیلتے کھیلتے قہقہہ لگانے لگے اور کبھی کبھی کسی برہن کے ہمراہ اس کی اُداس آہوں میں مل جائے ——— اور پھر سارے آکاش پر کالی کالی اودی اودی بدلیاں چھا جائیں۔ لوگ ملہار گائیں ہمیں جی بہلانے کے لئے۔ دنیا والوں کو کبھی پسند نہیں آنسو۔ اے کاش میرے جیون پر یہ کالی کالی بدلیاں چھا جائیں۔ اور میری روح ایک پاک اور مقدس بدلی میں تبدیل ہو جائے۔ میری آنکھیں جلنے لگیں ——— چہرہ سرخ ہو گیا ——— کھڑکی سے باہر اندھیرا تھا ——— ویران سی خاموشی، سرد ہوا سسکتی ہوئی۔ دم توڑ رہی تھی ——— گلاب کا سرخ پھول میری کھڑکی میں کبھی کبھی جھانکنے لگتا ——— مگر میری اداس دنیا اسے پسند نہ آئی اور وہ منہ چڑا کے پھر اپنے ساتھیوں میں مل جاتا۔ باہر بوندیں پڑنے لگیں ——— میرے بھی بے اختیار آنسو نکل پڑے دوسرے کمرے میں ریڈیو کی آواز اور اونچی کر دی گئی تھی۔ خورشید اپنی دلسوز آواز میں گا رہی تھی۔ گگن گگن دور دور گھٹا ہے چھائی اودو پیچھے یاد تیری آئی ——— نیلا پردہ مسکرانے لگا۔ اور شاہین جیسی کالی کالی چمکدار آنکھیں چمکنے لگیں۔ گلابی ہونٹ کانپنے لگے ——— باہر کھڑکی میں گلاب کا پھول مسکرا رہا تھا گاہے ریڈیو پہ ملکہ پکھراج اختر شیرانی کی غزل گا رہی تھی۔

جھوم کر بدلی اٹھی اور چھا گئی   ساری دنیا پر جوانی آ گئی

آہ وہ اس کی نگاہ مے فروش

آہوں کے بادل

رجنی —— او رجنی —— اری بولتی کیوں نہیں؟ ——
تو نے پتا جی کی تصویر کا شیشہ کیوں توڑ دیا؟ بتا —— نہیں بولے گی ——
کمبخت بتا —— میں اس وقت اگر ہوتا —— تو کم سے کم تیرا سر
ضرور پھاڑ دیتا۔ منحوس کہیں کی —— مرتی بھی نہیں ——

رجنی خاموش پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی —— وہ —— ایسے
چھلکتے ہوئے آنسوؤں کو پی جانا چاہتی تھی —— اس کا دل رو رہا تھا
وہ سوچ رہی تھی —— جب پتا جی زندہ تھے تو —— کوئی
مجھے ہاتھ تک نہ لگاتا تھا —— ۔ چاہے کتنی ہی بڑی سے بڑی شرارت
کرتی۔ کتنا ہی سخت نقصان ہو جاتا مگر کسی کی مجال تھی کہ کوئی ٹیڑھی نگاہ

سے بھی دیکھے۔ یہ نوبت کبھی بھی نہ آئی تھی ــــــــ کہ اتنی بھاری بھرکم لات ــــ
تصور صرف یہ تھا کہ پتا جی کی تصویر کا شیشہ ٹوٹ گیا تھا ــــــــ وہ بھی اس
کا قصور تو نہ تھا کمرہ صاف کرتے وقت جب تصویریں صاف کرنے لگی تو سورشا
نے شرارت سے سیڑھی ہلادی اور اس کے ہاتھ سے پتا جی کی تصویر گر گئی۔
جان جو پیاری تھی ــــــــ اگر وہ خود گر جاتی تو نہ جانے کتنی چوٹ لگتی مگر
اسی نے جلدی سے سیڑھی کے ڈنڈے پکڑ لئے۔ تصویر کا شیشہ تو پھر بھی لگ
جاتا ــــــــ کمبخت کھا کھا کر کتنا موٹا ہو گیا ہے۔ اتنی زور کی لات وہ
درد محسوس کرتے ہوئے کولھے کو سہلانے لگی ــــــــ ریشمیں شلوار پر ہاتھ
ہی نہ ٹھہرتا تھا۔ ریشم کی نرمی میں اس کی چوٹ بھی ختم ہو چکی تھی۔ فرش پر پڑے
ہوئے۔ رسالہ کے حروف اس کو آج اتنے بڑے بڑے کیوں دکھائی دے
رہے تھے۔ بالکل اسی طرح جس طرح عکسی شیشے سے نظر آتے ہیں۔ اس
کی نگاہوں سے دور رسالے کے درمیان۔ ایک موٹا چمکتا ہوا پردہ پڑ گیا
جس کی چمکدار کرنیں۔ آنسوؤں کے موتیوں سے پھوٹ پھوٹ کر کبھی نہ چھپی
کرنیں رقص کرتیں ــــــــ کبھی کبھی غائب بھی ہو جاتیں ــــــــ
یہاں تک کہ دو بوندیں رسالے پر گریں ــــــــ ایک جھٹکے میں رسالہ بھی
اس کے ہاتھوں میں نہ تھا ــــــــ سامنے کچھ دور زمین پر پڑا تھا ــــ
ہوا کے جھونکوں سے رسالے کا ورق پلٹ گیا ــــــــ موٹے موٹے

الفاظ میں لکھا ہوا تھا ـــــــ یتیم کی آہ ـــــــ سنسان سے
کمرے میں اس کا کوئی ساتھی نہ تھا ـــــــ یتیم ـــــــ وہ بھی تو
یتیم تھی ـــــــ مگر اس کی ہمدردیاں بھی تو ہے ـــــــ کیا وہ
پھر بھی یتیم ہے ـــــــ ہاں اسے یاد آیا ـــــــ پڑوس میں سرجنی
کی ماں نے ہر دفعہ یہی الفاظ استعمال کئے ہیں۔ آم، جامن جب بھی سرج
کھاتی اس کی ماں کہتی ـــــــ گیا۔ وہ سوچنے لگی ـــــــ ہاں ٹھیک
ـــــــ یہی کہتی تھی ـــــــ سروج بیٹی رجنی کو بھی دو ـــــــ
بیچاری یتیم ہے ـــــــ اسے کتنا بُرا لگتا تھا ـــــــ اس کا یہ فقرہ ـــــــ
کیا وہ بھوکی ہے ـــــــ یتیم ہے ـــــــ کیا اس کے گھر وہ
مانگنے جاتی ہے ـــــــ اتنی ذلیل تو نہیں۔ مگر وہ یتیم جو ہے ـــــــ
اس کی نگاہیں۔ رسالہ پر پھر جم گئیں ـــــــ یتیم کی آہ ـــــــ اس
کی بھی ایک آہ نکل گئی ـــــــ آہ میں بھی تو یتیم ہوں۔ مگر گھبرا کر اس نے
تاریک کمرے میں دیکھا ـــــــ کمرے میں کوئی بھی نہ تھا۔ صاف دروازے
چمکتی شیشہ دار تصویریں جو اس کی بے بسی پر مسکرا رہی تھیں کچھ حیران سی
اس کی بڑی بڑی پُرنم نگاہوں میں بہہ جانا چاہتی تھیں ـــــــ کھڑکی
سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اُسے رونے پر مجبور کر رہے تھے نہ جانے
کیوں ـــــــ کھڑکی سے باہر دور لمبی چوڑی سڑک کے اس پار سے اس

پار پر پیپل کے شکستہ پتے ناچنے کی کوشش کر رہے تھے ـــــــ اونھ بیہودہ سا رقص۔ وہ خود بھی زور سے بول اٹھی۔ مردہ جسم اب دوسروں کو دیکھ کر خود بھی ناچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

آج میں رنجیدہ ہوں ـــــــ مگر یہ ناچ رہے ہیں ـــــــ بدذوق بوڑھے ـــــــ بادل کی گرج سے اس کے خشک لب پھیلنے شروع ہوئے۔ نوکیلی سیاہ گھنی پلکوں کی نوکوں پر ٹھہرے ہوئے آنسو اب اس کی ریشمی شلوار میں جذب ہونے کی کوشش کرنے لگے ـــــــ ہوا میں پریشان سیاہ لٹیں اب گھٹا میں مل جانا چاہتی تھیں ـــــــ مگر… وہ بھی بے بس تھیں۔ اس کی آنکھیں اب سوج گئی تھیں، اودے سیاہ سے آسمان کو دیکھتے دیکھتے اب تھک گئی تھیں ـــــــ کھڑکی کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھے رکھے اس کی کہنیاں اب تھک گئی تھیں۔ وہ چاہتی تھی، ایک نرم ٹھنڈا سا ریشم کا بستر ہو۔ نرم ملائم سا ـــــــ جس پر وہ گر پڑے اور پھر کبھی نہ اٹھے ـــــــ وہ ابھی نہ جانے کیا کیا سوچ رہی تھی ـــــــ جو رامو کے کرخت جملے نے رجنی کو چونکا دیا ـــــــ برآمدے میں رامو ماں سے لڑ رہا تھا۔ تم نے ہی اسے سر پر چڑھا رکھا ہے ـــــــ ہر جائز و ناجائز بات پر اس کی جانب سے بول اٹھتی ہو یہ تمہاری طرفداری کرنے سے اور بھی شہ پاتی ہے۔ سودھا حیرت سے رامو کا منہ تک رہی تھی ـــــــ

ستون کی اوٹ میں سورنا، رجنی کی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے
باری باری ہر ایک کی محبت کا اندازہ لگا رہی تھی۔ رجنی کا بس چلتا تو سورنا
گلا گھونٹ دیتی سیڑھی ہلا کے دوسروں کو مار پٹوائی۔ اونہہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں
اب بھی بہت شیشے کے ٹکڑوں سے محبت کا اندازہ لگانے۔ بیوقوف ———
تصویر کا شیشہ ٹوٹ گیا۔ بن جائے گا۔ تو نے جو اس کے لات ماری۔ تو کیا اس
سے شیشہ جڑ گیا۔ بھلا سوچ تو برابر کی بہن۔ ہر وقت لڑائی دنگا چوبیس گھنٹے
سوائے اس کے اور کچھ بھی آتا ہے۔ دیکھو ماں، رامو نے پھر اسی لہجے میں
ہنکارنا شروع کیا۔ تم ہر بات میں مت بولا کرو۔ ہزار دفعہ تمہیں منع کیا۔ یہ
ہر وقت کا لاڈ۔ دیکھو کیا رنگ لاتا ہے . . . . گرم گرم . . . . ، سے
دو آنسو اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ اس کا کوئی بھی تو نہیں۔ رامو ایک
سال ہی تو بڑا ہے۔ مگر دیکھو کتنی حکومت جتاتا ہے۔ کیونکہ وہ مرد ہے۔ یہ غریب
مجبور سی عورت جو شیشوں کے ٹکڑوں میں انسان کی محبت ڈھونڈ رہی ہے
نادان، بھولی اور یہ مرد، جو مجبور سے انسان کو، دکھی دل کو، کچل کے دبے والے
کے مسکرانا جانتے ہیں۔ بے وقوف، سنگدل، کتنی نادان ہیں وہ عورتیں جو
پتھروں کی دیکھ بھال میں اپنے ہیرے کی چمک کھو دیتی ہیں ———
کاش ——— کاش میں اتنی مجبور نہ ہوتی ——— اس کے گلابی
رخسار اور بھی سرخ ہو گئے ——— گلابی ہونٹ کپکپانے لگے ———

میلے مٹیالے سے آسمان پر ہلکے پھلکے روئی کے گالے معصوم سے بادل ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے نہ جانے کہاں جا رہے تھے ــــــ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس کی پیچ دار لٹوں سے آنکھ مچولی کھیلنا چاہتے تھے۔ معصوم سے ساتھی، معصوم سے ساتھی کا دل بہلانے کی کوشش کر رہے تھے۔

زمین پر پڑے ہوئے رسالے کے ورق اس طرح ہوا سے الٹ رہے تھے۔ جیسے کوئی نادان تصویروں کی کتاب کی نئی نئی تصویریں دیکھنے کے شوق میں جلدی جلدی الٹنے کی کوشش کر رہا ہو ــــــ مگر اس کا تو ابھی دوسرا ہی ورق الٹا تھا ــــــ وہ یاد کرنے لگی۔ پتا جی۔ کتنی بے چینی سے سکول سے میری واپسی کا انتظار کرتے تھے۔ جب تک رجنی کھانے پر شریک نہ ہو ان سے کھانا نہیں کھایا جاتا تھا کتنے دن گذرے۔ وہ کتنی چھوٹی تھی پتا جی کی کیسی شکل تھی۔ کبھی لوگوں کو کہتے سنا تھا۔ رجنی کی تو بالکل بنی بنائی اپنے پتا کی شکل ہے۔ شاید اسی وجہ سے کبھی دفعہ وہ سوتے سوتے کسی کے گرم گرم سانس محسوس کرتے ہوئے راتوں کو اٹھ جاتی تھی۔ مگر وہاں تو اس کی ماں نظر آتی اس وقت اس کو کتنا پیار آتا تھا۔ ماما جی اسے جاگتا دیکھ کر ہنس کے کہہ دیتی۔ تم کتنی بری طرح سے سوتی ہو۔ سارا لحاف تو پلنگ کے نیچے پڑا ہوا ہے۔ میں تمہیں اڑھانے آئی تھی۔ کتنے اچھے دن تھے۔ جب وہ بالک تھی

انجان، کون سی ایسی خواہش تھی جو پوری نہ ہوئی ہو ــــــــ فضول بے کار سی۔ پتاجی وہ کھلونا لوں گی۔ بڑی سی گڑیا لا دو۔ ایسا جوتا نہیں پہنوں گی سرلا کی دیدی جیسا میں بھی لوں گی۔ کتنی بیوقوف تھی۔ اور اب ایک آرزو میں سال بیت جاتے ہیں۔ اس کا دل بھر آیا۔ آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔ ہاتھ کانپ رہے تھے دل دھڑک رہا تھا۔ ہچکیاں بندھ گئی تھیں دوپٹہ کا پلّو تر ہو چکا تھا۔ یکایک ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کسی اور کا دل بھی دھڑک رہا ہے۔ اس کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اُسے سینے سے لگائے ہوئے اس کے آنسو پونچھ رہا ہے۔ مگر آنسو پونچھنے والے کے آنسو اسکے منہ پر گر رہے ہیں جیسے وہ اس کی تکلیف کو محسوس کرتے ہوئے خود رو رہا ہے۔ مگر اس کے دکھتے ہوئے دل کو تسکین دینا چاہتا ہے۔ رومال میں سے اس نے پتا کی خوشبو سی محسوس ہوئی۔ وہی حنا کا عطر جو انہیں بے حد پسند تھا۔ وہ چیخ اٹھی پتاجی پتاجی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں ــــــــ کھڑکی کا دروازہ اس کی کہنی پر لگا۔ باہر زور کی بارش ہو رہی تھی۔ کھڑکی میں بندھی ہوئی چک کی ڈوری میں سے بارش کا پانی رس رس کر قطروں کی صورت میں اس کے رخسار پر بہہ رہا تھا۔ وہ کانپ گئی کمرے میں اندھیرا تھا دوسرے کمرے سے رامو کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ ساون کے نظارے ہیں؛ اہا اہا۔ اس نے

اپنی ڈبڈبائی نظریں مٹیالے سے آسمان پر گاڑ دیں ایک سرد آہ اس کے
کانپتے ہوئے لبوں تک آئی ــــــــــ اس کے مختصر کمرے میں . . .
دیواروں سے ٹکراتی ہوئی دور آسمانی فضاؤں ــــــــــ اور کالے
کالے بادلوں میں غائب ہوگئی ــــــــــ

دھواں

"مس صاحب۔ ذرا آگے سے ہٹ جائیں"۔ لوئس پھر اسی بارونق سڑک پر
تھی ـــــ تیزی سے دوڑ کر وہ فٹ پاتھ پر چلنے لگی ـــــ اسی طرح مریل سی چال
میں ڈوبی ہوئی ـــــ بیچاری لوئس ـــــ وہ گھبرا کر میٹھی نگاہوں سے
گذرتے ہوئے ـــــ خوش پوش بے فکروں کو دیکھنے لگتی ـــ کتنی نظریں مسکراتی
ہوئی ـــــ پاس سے گذر جاتیں ـــــ کیا مصیبت ہے یہ بیوقوف مرد ـــ
اونھو نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتے ـــــ مجسّم غلط فہمی ـــــ وہ یہی سوچتی
ہوئی۔ اپنے خوبصورت سینڈلز دیکھنے لگی۔ واقعی ـــــ میرے موٹے موٹے پیروں
میں کتنے اچھے لگتے ہیں ـــــ اور یہ سڈول ابھری ہوئی پنڈلیاں ـــــ مگر
اس کو اپنی رائے بدلنی پڑی ـــــ سامنے سے ایک اینگلو انڈین مس صاحبہ

کسی ٹومی کے ساتھ چہل قدمی کرتی ہوئی نظر آئیں ــــــ اس کے گورے گورے خوبصورت پیروں میں پرانے ڈیزائن کے سینڈلز جواب بہت ہی COMMON ہو چکے تھے کتنے اچھے لگتے تھے۔ اپنے سانولے رنگ کے پیروں کو دیکھ اس کے دیکھے ہوئے دل میں ایک ٹھیس سی لگی ــــ اے کاش میں بھی خوبصورت لڑکی ہوتی۔ مگر کسی خیال سے وہ چونک پڑی۔ اگر میں خوبصورت ہوتی ــــ اگر میں خوبصورت ہوتی، تو ــــ تو گریبی مجھے کبھی بھی نوکری نہ کرنے دیتی ــــ اور، اور نا ہی اتنا پڑھالیتی ــــ اور صبح شام کی سیر، یا تو ختم تھی۔ یا پھر گریبی کے ساتھ ــــ سائیکل کی گھنٹی کی آواز سن کر۔ اس نے مڑ کر دیکھا ــــ آج آپ بہت اداس ہیں شاید ــــ پاس سے گذرتے ہوئے۔ ایک چر کٹے حضرت جن کی مونچھیں بالکل ایسی تھیں جیسے ؛ جیسے وہ سوچنے لگی کیسی وضع تھی اس لفنگے کی مونچھوں کی ــــ ہاں ــــ ہاں۔ وہ چیخ اٹھی؛ کل جب ایلس کی چوڑی کھانے کی میز پر طبلہ بجانے کی مشق میں ٹوٹ گئی تھی دو ٹکڑے جیسے باریک چاند کے دو ٹکڑے ــــ کسی انجان نے کھیلتے کھیلتے چاند کے دو ٹکڑے کر دیئے ہوں ــــ مگر یہاں۔ اس لفنگے کی مونچھیں چاند جیسی کٹی ہوئی تھیں؛ مگر چاند کی طرح شفاف نہیں۔ سیاہ کالی، بالکل ایسی جیسے مونچھوں والوں کے دلوں کا رنگ۔ جیسے ــــ موٹے موٹے سگریٹ کے دھوئیں سے سیاہی مائل ہونٹ ــــ ہونٹ۔ سیاہی مائل۔ اس کو اپنے خشک ہونٹوں کو شیشہ میں دیکھنے کی ضرورت محسوس

ہوتی۔ مگر اس کو PURSE پرس سے سخت نفرت تھی۔ پھر شیشہ رکھے تو کہاں ——
اس کو بے چینی سی پیدا ہو گئی —— شیشہ۔ سوکھے ہوئے ہونٹ، مرجھائے
ہوئے ہونٹ جن کو زمانے کی سرد ہواؤں نے خشک کر دیا ہو —— کافی ہاؤس
چلنا چاہئے۔ دروازہ کھلتے ہی کتنا بڑا شفاف سا آئینہ لگا ہوا ہے —— جس میں
میزوں کے چاروں طرف لال لال چہرے خاکی وردی میں ملبوس جسم۔ سگریٹ کے سرمئی
رنگ سے پیچ دار —— گول گول —— سرمئی رنگ کے۔ کیسے نرم نرم ملائم
سے خم دار دھوئیں سیاہ جو بڑھتے بڑھتے۔ نہ جانے کہاں غائب ہو جاتے تھے۔ اسے
سگریٹ کی بو سے سخت نفرت تھی۔ جہاں کہیں کوئی سگریٹ جلائے تو اسکا سانس
گھٹنے لگتا تھا —— مگر نہ جانے اس کا مٹیالا سا سرمئی۔ سیاہ سا پیچ دار دھواں
—— کتنا لطف آتا تھا اس کو۔ اس دھوئیں کے دیکھنے میں۔ جب وہ تخئیلات کی
دنیا میں سرگرداں پھرتی ہو —— بھاگتی دوڑتی۔ نڈر۔ وہ سب کچھ کر سکتی تھی۔
اس معصوم دنیا میں۔ سب کچھ   اس کا جی چاہتا کہ اس کے سامنے اندھیرے
کمرے میں۔ ایسے اندھیرے کمرے میں، ایسا اندھیرا۔ جب آسمان پر سیاہ اودی
اودی مٹیالی سی بدلیاں چھا جائیں۔ اور دنیا کے اوپر باریک سی سرمئی رنگ کی چادر
ڈالنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ پرندے خوفزدہ سے اپنے اپنے آشیانوں میں ننھے ننھے
دھڑکتے ہوئے دل لئے واپس لوٹتے ہوں —— ٹھنڈی ٹھنڈی۔ سرد ہوا کے
جھونکے —— دریچے کے پردوں سے اٹکھیلیاں کر رہے ہوں، ایسے اداس

سے ہے۔ ایسے خاموش سے کمرے میں۔ اس اندھیرے میں ——— کوئی اس کے
سامنے بیٹھا رہے۔ سگریٹ کے مٹیالے دھوئیں میں خود کو چھپائے ———
بے حس سا ——— پریشان سے بال ——— مجسم درد ——— لمبی لمبی
کمزور سی خوبصورت لرزتی ہوئی انگلیوں میں کانپتی ہوئی شکسپیر کی رنگین زندگی کی
تصویریں۔ تھرکتی ہوئی۔ گذرتی رہیں۔ سگریٹ کے مٹیالے پیچ دار دھوئیں میں ———
اور وہ یونہی بے حس سی۔ مردہ ——— زندگی کی تصویریں مردہ ڈھانچہ ———
نرم نرم گدوں دار کرسی میں دھنسی پڑی رہے ——— بجھے ہوئے جذبات
کو ——— اور بھی ——— گرم گرم پاک آنسوؤں سے بجھا دینا چاہتی
تھی ——— نہ جانے کیوں ——— یہ اس کی کبھی سمجھ میں نہ آتا تھا ———
وہ چاہتی تھی ——— کسی کی بڑی بڑی معصوم سی چمکدار آنکھوں میں۔ ایسی چمکدار
آنکھوں میں۔ جن کے جام ہمیشہ لبریز ہوں ——— اور جو چھلکنے کے لئے بے قرار
ہوں ——— وہ ان شفاف نگاہوں کے مچلتے ہوئے چمکیلے چشمہ میں سے ———
نہ جانے کیا ڈھونڈنے کے لئے بے قرار ——— رہتی ——— اوہ ———
وہ ایک جھٹکے کے ساتھ ——— اچھل پڑی۔ سوری ———
پاس سے گذرتے ہوئے۔ ایک گھونگھریالے بالوں والے نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا ———
لوئس کے جسم میں سنسنی سی پھیل گئی۔ نوجوان اس وقت اپنے بازوؤں کو جھاڑنے میں
مصروف تھا ——— اس کے خم دار ابرو ——— جیسے چاند کے

دو ٹکڑے ——— الگ الگ لگا دیئے گئے ہوں ——— اور ان کی
نوکیں۔ نیچے کی طرف جھکی ——— لمبی لمبی سیاہ نوکیلی پلکوں کو ایکبار ———
صرف ایک بار چوم لینے کی خواہش لئے ہوئے تھی ——— مدت سے اور نہ جانے
کب تک اسی انتظار میں تھی ——— وہ سوچنے لگی ——— کیا میرے کپڑے
خراب ہیں ——— یا میرا جسم یعنی میرا گداز سا بازو ——— یکایک اس
کے سامنے ——— نارائن دیوی کا وہ بدبودار سرخ رنگ کا ٹیالا سا لہنگا ہوا
میں اڑنے لگا ——— اور اس کی سیاہ رنگ کی موٹی موٹی پنڈلیاں جن
میں چاندی کے جھانجن ——— جو ہمیشہ خوشی سے ناچتے رہتے ———
کیا آپ ناراض ہو گئیں ——— اس کے خم دار ابرو اور بھی تن گئے' اس نے
غصے سے اپنے انجان ہمدرد کی طرف دیکھا۔ اونہہ بیہودہ سا انسان۔ وہ سچ مچ۔
اپنے سلک کے رومال سے اپنا منہ پوچھنا بھول گیا۔ نامعقول سا انسان ———
میں کب تجھے پسند کرتی ہوں۔ بے وقوف ——— پاجی ——— اس کے
کالج کا بیوقوف سا کیشتر یاد آ گیا ——— جو ہمیشہ پہلی دوسری کو سونے کی
گھڑی لگا کر آیا کرتا تھا ——— اور وہ اسے روپے گنتے وقت۔ گرمی محسوس کرتے
ہوئے اپنی قمیص کے سفید کف کو بار بار الٹنے پر مجبور تھا ——— اور کف کے
نیچے سے ایک خوبصورت گولڈن واچ مسکراتی ہوئی نظر آ جاتی ——— اس کے
ساتھ ہی گھڑی کا مالک بھی مسکرا کر روپے گننے لگتا ——— چھچھورا سا انسان

کل ہی کی تو بات تھی۔ جب ہم اپنی تنخواہ لینے اس کے کمرے میں گھسے ـــــ اس سے پہلے وہ لال پیلا رنگ کئے ہوئے چپراسیوں سے لڑ رہا تھا ـــــ پڑھنانہ جانے ایک لفظ ـــــ تنخواہ لینے آجاتے ہیں۔ ہنہہ۔ اس نے اپنی لمبی سی ناک کا ایک سرا۔ اونچا کر کے کہا۔ اور ہمیں دیکھ کر ـــــ وہ ریشمی سرخ رومال سے منہ پونچھتے ہوئے آگے بڑھا ـــــ ہلو مس لوئس ـــــ اوہ مس شرما ہاؤڈو یو ڈو Howdo you do. ـــــ اور اس نے مسکراتے ہوئے ساری پروفیسرز کی مزاج پرسی کرتے ہوئے کرسیاں پیش کیں ـــــ آپ لوگ تشریف رکھئے میں ابھی فارم لایا ـــــ (THANKS) تھینکس مس شرما اور او میتا سین نے کرسیوں پر بیٹھتے ہوئے کہا ( )
بے بی۔ مس شرما نے اپنی سرمہ کی دنبالہ دار آنکھوں کو بھراتے ہوئے میری اداس نگاہوں میں دیکھتے ہوئے۔ میرے گوشت سے ابھرے ہوئے ہاتھ پر ایک باریک سی چٹکی لیتے ہوئے کہا TAKE YOUR SEAT سٹ ڈاون بے بی ـــــ میں جبراً مسکرا دی ـــــ کاش میرے تخیلات کی کوئی قدر کرے۔ میری بے چین دنیا کے طوفانوں میں۔ کوئی ایک منٹ تو ٹھہرے۔ لاپرواہ انجان معصوم سی لہریں جب میرے سنسان سے ساحل سے ٹکراتی ہیں ـــــ تو ـــــ اس کا درد اس کی جبین میری بے قرار آنکھوں میں سما جاتی ـــــ شاید اسی وجہ سے پرجیت کنول نے مجھے چھیڑتے ہوئے اکثر ـــــ کالج گراؤنڈ کے سنسان حصے میں جہاں ہم اکثر

دو دو گھنٹے یونہی، امرود کے پیڑ کے نیچے ـــــ نہ جانے کیا کیا بکواس کیا کرتے تھے ـــــ اور پکے پکے امرود ـــــ امرود ـــــ سفید بے داغ ـ ہرے ہرے جن کے رخساروں پر ننھے ننھے سرخ دھبے ہرے ہرے پتوں میں سر جھکائے ہماری ہی باتیں کس شوق سے سنتے تھے ـ اور ـ وہ نامراد ـــــ کوئل ـ ٹھیک ہمارے آتے ہی ـــــ کوکنا شروع کر دیتی ـــــ اس کے پروں کو دیکھ کر نہ جانے مجھے پھر سگریٹ کا دھواں کیوں یاد آجاتا ـــــ ٹیالہ سا نرم ریشم جیسا ـــــ اندھیرے کمرے ہیں ـ جہاں دریچے سے، دم توڑتے ہوئے سورج کی وہ اداس سی کرنیں جنکی مدھم روشنی ـــــ صرف سگریٹ کا دھواں سنہری پریشان سے بال ـــــ جن کی چمک ـــــ کچھ کچھ آنکھوں کی پتلیوں میں بھی آجائے ـــــ گلابی مگر خشک سے ہونٹ ـــــ لرزتی ہوئی لمبی لمبی نازک سی انگلیاں ـــــ جو ایک بے جان پھسلتے ہوئے سگریٹ کو بھی نہ تھام سکیں ـــــ وہ ایک بار صرف ایک بار ان لمبی لمبی کمزور سی انگلیوں کو پکڑ کر زور سے مروڑ دینا چاہتی تھی وہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ لرزتی ہوئی پتلی پتلی لمبی نازک سی انگلیاں کتنی لچکدار ہیں ـ شاید یہی سوچتے ہوئے اس نے ایک نئے سگریٹ کو تھوڑا سا خالی کر دیا تھا ـــــ جس سے وہ اور بھی لجلجا ہو گیا تھا ـ مگر پھر بھی وہ، ایکبار ان لرزتی ہوئی کانپتی ہوئی انگلیوں کو چھونا چاہتی تھی ـ اس طرح ـــــ جیسے، کل جب وہ امرود کے پیڑ کے نیچے لنچ ٹائم میں سر جیت کے ساتھ کھانا کھا کر امرود کے پیڑ کی جڑ کے پاس ہاتھ دھوتے

ہوئے۔ زور سے چیخ اٹھی تھی۔ بدن میں ایک سنسنی سی پیدا ہو گئی تھی وہ اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں کو دانت میں بھینچنے لگی تھی۔ اس کے بعد وہ دن بھر نہ ہنسی، مگر اس نے چلتے دفعہ آہستہ سے ڈرتے ڈرتے مری ہوئی کوئل کو جس کے پر سگریٹ کے دھوئیں جیسے مٹیالے تھے، کھلے ہوئے بے جان پر، وہ کئی دفعہ جھکی اور ہچکچا ڈر کر ایک دفعہ کانپتے ہوئے آنکھیں بند کر کے۔ اس کے مردہ جسم کو اپنی لمبی لمبی کانپتی ہوئی انگلیوں سے چھو ہی لیا۔ نرم نرم سے پروں میں سخت سا جسم ———— اس کے سارے بدن میں کپکپی سی پیدا ہو گئی تھی ———— اس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ وہ سارا دن ہنس سکی نہ جانے کیوں۔ فلاسفی کے پیریڈ میں وہ کتاب سامنے رکھ کر ———— وہ تھکی تھکی نگاہوں سے سفید سفید چمکتی ہوئی پیشانیوں کو گھورنے لگی۔ ایک دفعہ ہی وہ چونک پڑی۔ اس کے سامنے پردہ میلا ہلکے سرمئی رنگ کی جارجٹ کی ساڑھی میں ملبوس ———— چاک سے اپنی میز پر تصویر بنانے میں مشغول تھی۔ اور بھی چند لڑکیاں چاک سے اپنے اپنے نام کے پہلے لفظ کو بنا بنا کر لکھنے کی مشق کر رہی تھیں۔ نہ جانے اس کی آنکھوں میں کیوں آنسو آ گئے ———— اس نے لرزتی ہوئی آواز میں یہ فقرہ کہا "اکسکیوز می گرلز" اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ کتنا اداس دن تھا سرمئی مٹیالی سی بدلیاں تھیں جو ایک جہان پر چھائی جاتی تھیں۔ اس کا دل گھبرانے لگا ———— وہ چونک پڑی سامنے سے تین صاحب زادیے ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے ڈبے لئے ہوئے۔ آپس میں موجودہ فیشن پر رائے زنی کرتے ہوئے پاس سے گذرتے

بوٹ پالش ــــــ مگر پھر کپڑے کے سینڈلز دیکھ کر مسکرا کر رہ گئے ــــــ جیب سے بیڑی کے بجھے ہوئے ٹکڑے نکال کر ــــــ بیڑی پینے کی مشق کرنے لگے ــــــ میلی پھٹی ہوئی قمیصوں میں سے تنے ہوئے چھوٹے چھوٹے سینے ابھارتے ہوئے، مذرا یونہی سا گنگنانے لگے تم روٹھ گئیں روٹھ گئیں او ہو تم روٹھ گئیں، اس نے مڑ کر دیکھا ان میں سے ایک صاحب زادے جو دو سے بڑے تھے۔ ایک آنکھ میچتے ہوئے نظر لگے، وہ حیرت سے لمبی چوڑی سڑک پر دیکھنے لگی ــــــ پریشان سی ــــــ وہ اب عنقریب رونے والی تھی ــــــ مگر یکایک اس کو ہرے رنگ کے بڑے بڑے دروازے آدھے کھلے سے ملے ــــــ شاید وہ مسکرا رہے تھے۔ اس کی ہچکی پر ــــــ وہ تیزی سے بڑھی اور وہ تیزی سے سانس لے رہی تھی ــــــ ہیلو۔ ہاؤ ڈو یو ڈو ــــــ وہ پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی ــــــ اس کے پاس تو کوئی سرخ چیز بھی نہ تھی۔ فراک نیلی تھی اور سینڈل بھی نیلے تھے سرخ تو نہ تھے پھر ــــــ ایک سیٹی کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ مڑی ایک صاحب پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اکڑتے ہوئے پاس سے نکل گئے۔ وہ گنگنا رہے تھے۔ اے دل مجھے رونے دے، اے دل مجھے رونے دے ــــــ وہ مسکرا دی اس کا بے اختیار جی چاہا کہ زور سے چیختی ہوئی بھاگتی ہوئی گذر جائے اور ایسا زور سے ان کے کلین فیس پر ایک چپت لگائے کہ یاد ہی تو رہے' اے دل مجھے رونے دے، اس وقت یہ گاتے ہوئے کتنے اچھے لگیں گے جناب جب آپ کی شکل بھی رو رہی ہو ــــــ مگر نہ جانے کیوں نہ

بھاگ سکی ——— آخر تھا نہ اس ہی ہندوستان کا خون۔ اگر رنگ بھی سفید ہوتا تو مجال تھی کسی کی جو اس کو کوئی رستے چلتے چھیڑ بھی دے مگر اِس سانولے رنگ میں بھی نہ جانے کیا کشش تھی۔ وہ خود حیران تھی ——— جوزف کتنا ہینڈسم ہے بھوری بھوری شفاف سی چمکیلی آنکھیں، جیسے کچھ کہہ رہی ہوں شرارت سے پُر آنکھیں ——— بی۔ اے کر کے بھی ابھی تک شرارتیں ایسی ہی ہیں جیسے آٹھویں نویں کلاس میں پڑھنے والا اسٹریر لڑکا ——— مگر اس کی نگاہیں ایسی کیوں ہیں ——— جیسے جیسے ——— دیکھتے دیکھتے ہی وہ اپنے اندر کھینچ لیں گی۔ دنیا کی ہر ایک چیز اس کی ساری مسکراہٹ اس کی نگاہوں میں سمٹ کر آجاتی ہے۔ اوہ گوڈ۔ وہ ذرا سا منہ بنا کر رہ گئی جیسے کڑوی دوا پی لی ہو۔ مگر پاس سے گزرتے ہوئے خوش پوش بے فکروں کی ٹولیوں سے وہ گھبرا گئی۔ اور چہرے پر مسکراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ فٹ پاتھ سے اترتے وقت اس کا پیر مڑ گیا تھا۔ وہ اس موچ کو بھی بھول گئی تھی۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں نظر آ رہی تھیں۔ اس کا جی چاہا کاش اس وقت جوزف میرے ساتھ ہوتا، میں پھر کتنی بے تکلفی سے چلتی، ان شریف لفنگوں کے دبے دبے قہقہے سن سکتی۔ آہ جوزف۔ مگر وہ کس قدر لاپرواہ ہے کتنی مدت ہو گئی مگر میں اس کو اب تک نہ پہچان سکی۔ اس کا بھی کیا قصور۔ اس کی دولت کا قصور۔ کاش وہ امیر نہ ہوتا۔ اس کی بہنیں کتنی مغرور ہیں۔ میں جوزف سے مل کر کتنی خوشی محسوس کرتی ہوں۔ مگر اس کا یہ فقرہ سن کر میری ساری خوشی خاک میں

ماں جاتی ہے۔ میرا سارا خون خشک ہو جاتا ہے۔ جب وہ کہتا ہے کل میرے گھر آؤ۔ شام کی چائے وہیں پی لینا۔ ہائے رے کیسے بتاؤں اس کو۔ اس کا وہ شاندار ڈرائنگ روم بڑے بڑے ہال، وہ شاندار سی کوٹھی، وہ قیمتی قیمتی فرنیچر وغیرہ۔ اس روز جب میں ماما کے بے حد مجبور کرنے پر گئی تو ڈرائنگ روم دیکھتے ہی میری ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔ رنگ زرد ہو گیا تھا۔ سر میں چکر آنے لگا تھا اگر جوزف نہ تھام لیتا۔ کتنے پیار سے اس نے جھک کر پوچھا تھا۔ اوہ ارنکس تمہیں کیا ہوا۔ طبیعت کیسی ہے۔ وہ گھبرا سا گیا تھا۔ اس کی گھبراہٹ دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہوئی تھی کہ اس کو میرا کتنا خیال ہے۔ مگر پھر اس کی دولت کا خیال آتے ہی مجھے نفرت سی ہونے لگی۔ میرا جی چاہا جوزف کا ہاتھ پکڑ کر بھاگتی چلی جاؤں دور جہاں کوئی بھی نہ ہو۔ جہاں اس چیز کا امتیاز نہ ہو کہ یہ لڑکی غریب ہے اور یہ لڑکا امیر ہے لڑکی کوئی خاص خوبصورت نہیں۔ نہ جانے جوزف کو کیا ادا پسند آئی۔ دنیا میں ہزاروں خوبصورت لڑکیاں ہیں آخر اس معمولی سی رنگت میں کیا نظر آیا۔ اور وہ اس کی بہنوں کی طنز آمیز مسکراہٹ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس نے کئی دفعہ جوزف سے کہا بھی تھا کہ جوزف تمہیں کسی چیز کی کمی نہیں۔ اس بے مہ دنیا میں ہزاروں نازک اور خوبصورت پھول ہیں، جو تمہارے قیمتی کوٹ پر بے حد اچھے لگیں گے صرف فرق اتنا ہوگا کہ ان میں سے تھوڑی دیر بعد خوشبو آئے گی۔ جب وہ تمہارے قیمتی کوٹ کو دیکھیں گے مگر بلاؤٹی خوشبو ہو گی۔ تو اس سے دنیا کو کیا مطلب تمہارے خاندان کو اس سے کوئی مطلب نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ تمہارے قیمتی کوٹ پر خوبصورت سا پھول نظر آئے تاکہ دنیا

اسے دیکھ سکے۔ اور تمہاری بہن خوشی سے ناچتی ہوئی پھول والا ہاتھ چھوڑ کر خالی ہاتھ
میں چھوڑتی ہوئی اس دنیا کی منزل پر چلیں ــــــــ میرے جوزف تم اس پھول کو
چھوڑ دو۔ جو ایک کٹیا کی کیاری میں تمہیں نظر آیا۔ تم کسی شاندار کوٹھی میں سے خوبصورت
سا پھول توڑ لو ــــــــ اس کٹیا کے پھول میں تمہاری ہی مہک رہے گی اور آخر
تک وہ کسی انسانی قدموں میں نہیں گرے گا۔ بلکہ تمہارے دھیان میں مست اپنا
جیون دیوتا کے قدموں میں نچھاور کر دے گا۔ اور اس کی سوکھی ہوئی پنکھڑیاں مندر
کے منڈل کے چاروں طرف زمانے کی ہواؤں سے ادھر اُدھر بکھری بکھری پھریں
گی۔ صرف اس انتظار میں کہ تم آؤ مندر میں دیوتا کی پوجا کے لئے۔ ایک تازہ خوبصورت
پھول کے ساتھ۔ اور دیوتا کے چرنوں میں جھکنے سے پہلے۔ اس پھول کی منتشر
پنکھڑیاں یک جا ہو کر۔ تمہارے چرنوں میں ہوں گی۔ کتنا اچھا کتنا شبھ سما ہوگا ــ
جب ایک پھول اپنے دیوتا کی پرستش کرتے کرتے اپنے دیوتا کے چرنوں میں سسکتا
ہوا آخری سانس لے رہا ہو۔ اور اس کا انسانی دیوتا اپنے مذہبی دیوتا کو یونہی چھولنے
آگیا ہو۔ دنیا کے ڈر سے، پوں پوں نہ جانے ہارن کی آواز کب سے سنائی دے رہی
تھی، جیسے دور بہت دور کوٹھی کے پچھلے کمپاؤنڈ میں کوئی بچہ ایسے ہی بھاگتے بھاگتے
بھونپا بجا رہا ہو۔ پوں پوں ــــــــ پوں اور بھاگتے ہوئے آس سے آکر اس کی
سانولی سانولی ٹانگوں میں لپٹ جائے۔ اور اس کے سارے جسم میں ایک جھٹکا سا
لگا۔ اور وہ خود کو روکتے ہوئے بھی سڑک پر گر پڑی۔ اس کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے

چاروں طرف سگریٹ کا دھواں ہی دھواں آسے گھیرے ہوئے ہے۔ اس کو ایسا
معلوم ہوا کہ وہ اندھیرے کمرے میں جہاں ایرکنڈیشن سسٹم ہے۔ اندھیرے زینے
میں اُترے چلی جا رہی ہے۔ جلدی جلدی، حیرت ہے بغیر کسی سہارے کے اترتی
چلی جا رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی دیواریں اس کی پیشانی پر جیسے ٹھنڈا ٹھنڈا پانی بہہ رہا
ہو ——— اور پھر وہی ٹیالا سا سگریٹ کا دھواں لمبی لمبی کمزور سی نازک
سی پتلی پتلی انگلیاں۔ جو ایک نرم نرم پھلیے سگریٹ کو کبھی نہ تھام سکیں سنہری پھولے
ہوئے بال کرل سے جن کا سنہرا پن۔ آنکھوں کے نشیلے پن پر چھا جائے۔ آہ۔ جوزف کی
وہ نشیلی سی بے تاب نگاہیں۔ مگر آہ کاش وہ اسیر نہ ہوتا ہیا تو پھر اس روز اس کی لمبی لمبی
لرزتی ہوئی انگلیاں۔ جیسے تڑپتے ہوئے دل کی بے چینی اس کی ٹیس ——— [illegible]
سے نغموں میں تبدیل ہوگئی تھی -اس کی کئی دفعہ ہاتھوں کی مٹھیاں بندھ گئیں۔ تھرکتی
ہوئی مچلتی ہوئی لرزتی ہوئی منعدد کالی لکڑیوں پر لمبی لمبی سانولے رنگ کی کمزور سی انگلیاں
مگر وہ ان کو چھو نہ سکی۔ سگریٹ کے ٹیالے سے دھوئیں میں ناچتی ہوئی جوزف کی
آنکھیں اسی پر مسکرا رہی تھیں اس کے شاندار ڈرائنگ روم جس کے قالین پر پاؤں
رکھتے ہی اندر گھس جاتے تھے۔ اس کے گدیلے صوفے جس میں اس کی اس قدھوئی
گر یہ بھی گھس جاتی تو نظر نہ آئیں کس قدر نرم تھے صوفے کے بازو کہ اگر ان پر کہنیاں ٹیک
دو تو پتہ بھی نہ لگے کہ ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ اور وہ گول گول قیمتی ریشم کے چھوٹے چھوٹے صوفے
پر پڑے ہوئے تکیے جن کی جیسے ضرورت ہی نہ ہو۔ جو ہے ان غریبوں کو موڑتا ہی رہتا ہے

ایک روز تو اس نے اس چھوٹے سے تکیہ کو مسکرا کر اپنے سینے سے لگا کر زور سے بھینچ دیا تھا جیسے وہ بھی کوئی چھوٹا سا خوبصورت بچہ تھا۔ کہ پکڑ کر دبوچ لیا اور اتنا بھینچا کہ وہ غریب اپنا نازک سا نچلا چھوٹا سا ہونٹ نکال کر رونے لگے۔ مگر، اوہ۔ اس کے سر میں جلن سی ہو رہی تھی اور جیسے وہ کسی کی گرم سی پتلون پر اپنے ہاتھ رکھ لیتی ہے۔ اور اس کے چاروں طرف زور زور سے شور ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی سیڑھیاں ختم ہو چکی تھیں۔ پیانو بھی اب غائب ہو چکا تھا۔ سگریٹ کا دھواں بھی غائب ہو چکا تھا۔ اور وہ اب ایک روشن سی جگہ پر تھی۔ ٹانگیں تو اٹھائی بھی نہیں جاتی تھیں۔ جلن سی ہو رہی تھی۔ اور بدن جیسے تھا ہی نہیں۔ وہ اپنے آپ کو بڑا ہلکا سا محسوس کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں میں ایک قسم کی اینٹھن سی ہونے لگی۔ جیسے ساری طاقت کوئی کھینچ رہا ہے۔ اس نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں۔ آسمان پر سیاہی پھیل گئی تھی، جیسے بہت سے سگریٹ پی پی کر چھلے دار دھواں کوئی سارے آسمان پر چھوڑتا جا رہا ہو۔ آہ وہ کروٹ لینا چاہتی تھی مگر سانولے سے ہاتھ اس کی کمر پر پھرنے لگے۔ نہیں لوئس ڈارلنگ نہیں بڑی سخت چوٹ آئی ہے کروٹ نہ لو۔ وہ آواز سے چونک پڑی تیز تیز گرم سانس اس کے ماتھے سے ٹکرا رہے تھے۔ اور لمبی لمبی کمزور سی انگلیاں کانپتی ہوئی خوبصورت سی انگلیاں اس کے ٹھنڈے ٹھنڈے چہرہ پر تیر رہی تھیں۔ سنہری بال سفید سی پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ اور کھوری کھوری سی نشیلی نگاہوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اس کی ٹانگوں کے پاس مٹیالے رنگ کی ساڑھی میں ملبوس

گورے گورے رنگ کا ایک جسم جو سر جھکائے۔ اس کی سانولی سانولی پنڈلیوں کو کسی چیز سے کس کر باندھنے میں مشغول تھا۔ بھوری بھوری آنکھوں سے اب بڑے بڑے آنسو گرتے ہوئے اس کی خون سے بھری ہوئی پیشانی دھو رہے تھے گیلے گیلے ہونٹ نہ جانے اب خشک کیوں ہو گئے تھے۔ کانپتے ہوئے لبوں سے لرزتی ہوئی آواز نکلی لوئس مجھے معاف کر دو میں نے کئی بار ہارن دیئے۔ اور سپیڈ کم کرتے کرتے بھی تم چھپٹے میں آ گئیں میری معصوم لوئس۔ مجھے معاف کر دو میں بے قصور ہوں — سانولے ہاتھ آپس میں جڑ گئے۔ لمبی لمبی کمزور سی انگلیاں آپس میں لپٹ گئیں۔ اس کا سر اس کے چہرہ پر جھک گیا۔ اس کے براؤن کوٹ میں لگا ہوا سرخ گلاب کا پھول اس کے آہستہ آہستہ دھڑکتے ہوئے دل کے پاس آ گرا۔ مٹیالی ساڑھی کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی سیاہ جوڑے میں لگے ہوئے سفید گلاب کے پھول قہقہے لگا رہے تھے اس کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ اس کے جبڑے خود بخود بھینچنے لگے۔ اس کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے سارے جسم کی طاقت مٹیالی سی ساڑھی میں جیسے کھنچی چلی جا رہی تھی۔ اور اس کے چاروں طرف اودا اودا سیاہ مٹیالا سا سگریٹ کا دھواں گول گول لچھوں کی صورت میں تیرنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سگریٹ کے نرم نرم سیڑھیوں پر سے اترتی چلی جا رہی تھی۔ بغیر کسی سہارے کے ایکدفعہ ہی اس نے اندھیرے میں لمبی لمبی کمزور سی انگلیوں کو زور سے پکڑ کر مروڑ دیا۔ نرم نرم لچکدار سی ہڈیاں اور تو کچھ بھی نہ تھا ان انگلیوں میں جن کے چھونے کی تمنا وہ اپنی زندگی میں

چھپائے رہی۔ مگر آج جب وہ ان کانپتی ہوئی انگلیوں کو پکڑ کر مڑ وڑ چکی، تو اس کے
چہرہ پر اُداسی سی پھیل گئی۔ زرد سے چہرہ پہ ایک طنز یہ سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔
اور اس کی روح سگریٹ کے مسرمئی پیچ دار دھوئیں میں نہ جانے کہاں غائب
ہو گئی تھی۔ بالکل اس طرح جیسے ایک کش لینے کے بعد۔ دھواں پچھے دار دائرے
بناتا ہوا نہ جانے کہاں غائب ہو جاتا ہے۔ سڑک کے چاروں طرف۔ آدمیوں کے
سر ہی سر نظر آتے تھے۔ اور ان سروں کے بیچ میں سے کالی سی کار۔ بالکل ایسی لگ
رہی تھی جیسے کسی کی لاش کا بکس رکھا ہو۔ مجمع تتر بتر ہونے لگا۔ اور کالی کار ٹھیالی
ساڑھی والے جسم کو۔ بھورے کوٹ کو اور سانولے سے مردہ جسم کو لے کر ٹھیالے
دھوئیں میں غائب ہو گئی۔ سڑک پر خون بہہ رہا تھا۔ اور فٹ پاتھ کے پاس ایک
پیر کا سینڈل خون میں لتھڑا ہوا پڑا تھا۔ کپڑے کا سینڈل۔ بوٹ پالش۔
سنسنان سی سڑک پڑی تھی صاحب زادے لرزتی ہوئی آواز سے۔ آواز لگانے
لگے۔ بڑے صاحبزادے نے حیرت سے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ابے
یار ابھی تو یہ میم صاحب اس موڑ پہ ملی تھی۔ اور میرے گانے پہ کیسے گھور کر دیکھا تھا
دیکھا کیسے دم نکلا ہے خدا غریب کی بڑی جلدی سنتا ہے۔ اور مسکرا کر بیڑی کا ٹکڑا
سلگانے لگا۔۔ اور چھوٹے چھوٹے پیچھے دار پہلے سے بدبودار دھوئیں چھوڑتے ہوئے
یونہی سا گنگنانے لگا۔ سانجھ کی بیلا ۔۔۔ پنچھی اکیلا ۔۔۔ ساری سڑک پہ ایک قسم کا
دھواں پھیلا ہوا تھا۔ آسمان سے زمین تک ٹھیالا سا دھواں ہی دھواں تھا ۔۔۔

آگ جل رہی تھی

۔۔ پروین! او پروین ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پروین کی بچی کہاں ہے بھئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
اللہ میں نے جھلا کر رخسانہ کو چپکے سے کوسنا شروع کیا ــــــ کمبخت میرے پیچھے
ہی لگی رہتی ہے ــــــــــ مگر میں بھی تو اسی اندھیرے میں کھڑی ہوں
اُف اللہ کس قدر سردی ہے۔ میرے ہاتھوں میں فوراً ہی یا ان کانپنے لگا۔ شاید سردی
سے یا ڈر سے۔ مگر ڈر کس بات کا۔ میں نے کوئی گناہ تو نہیں کیا ــــــ نہیں ۔ ۔ ۔
میرے خیال میں عزت میں بٹہ لگنے والی کوئی بات ہے ــــــ پھر مجھے الجھن سی
ہونے لگی۔

آخر کوئی بات بھی ہے۔ اسی گُتھی رخسانہ کی۔ برابر والی خانہ میں پپیتوں کے
پیڑوں کے جھنڈ میں کھڑی پکارے جا رہی ہے۔ اونھ بکے جائے میری بلا سے

یہ بات بھی تو ہے۔ دوسروں کی باتیں چھپ چھپ کر سننا بری بات ہے۔ یہ تو معلوم ہے۔ مگر پھر بھی ایک عجیب سی خواہش تھی جو کروٹیں بدل رہی تھی۔ اکسا رہی تھی کہ ان غریب نیچے طبقے کے لوگوں کی اندرونی دنیا کیسی ہوتی ہے۔ آپس میں ان کی محبت کی کتنی مقدار ہے۔ کیا ان کی محبت کے شوالے بھی کھوکھلے ہوتے ہیں۔ ذرا طوفان آیا اور ڈھے گئے اور پھر تو ایسے نیست و نابود ہو جائیں جیسے یہاں عمارت تھی ہی نہیں۔ کسی کے خونِ آرزو میں گوندھی ہوئی نیو پڑی ہی نہیں تھی —— ذرا دنت پڑا اور صفاچٹ میدان۔ اتنی اونچی اونچی رنگین عمارتیں۔ کہ پہلی آزمائش ہی میں —— اڑاڑا دھم جب آنکھ کھلے تو اپنے چاروں طرف گرد و غبار ہی گرد و غبار۔ ایسا گرد و غبار —— جس میں ٹٹولتے ہی رہ جاؤ۔ مگر راستہ نہ ملے۔ مجھے بے حد سردی لگنے لگی۔ فرائی پان میں اب انڈے کی زردی زور زور سے سفید لیس دار پانی میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ ارے امی جان نے مجھے کب کا بھیجا تھا کہ ان انڈوں کا آملیٹ بنا لاؤ —— آج وہ پھر خدائی مارے آپا جان کے لگتے سگنے آ دھمکے۔ کمبخت ہتیا ہم پر پڑتی ہے۔

باورچی خانے میں منو کی ماں پھر زور سے ہنسی۔ میرا دل دھڑکنے لگا —— چھوٹی سی اینٹ پر میں نے ڈرتے ڈرتے اچک کر دیکھا۔ اینٹوں کی جالیوں میں سے۔

آگ خوب تیز جل رہی تھی۔ دھڑا دھڑ لکڑیاں جل رہی تھیں کچھ چھوٹی

چھوٹی چھپتیاں چرچرائیں اور بھڑک کر دھیمے دھیمے جلنے لگیں۔

چولھے کے سامنے منو کی ماں ملگجی سی چادر اوڑھے۔ آہستہ آہستہ بے انتہا ہنس رہی تھی۔ سانولا رنگ اب بے حد سُرخ ہو گیا تھا —— چھوٹی چھوٹی سی چندھی سی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میلا سا پانی۔ میرا جی متلانے لگا۔ —— اسی کی آنکھیں ہیں کہ ہر وقت چھپچاتی رہتی ہیں۔ جب دیکھو آنسوں سے رستے رہتے ہیں —— اور پھر —— وہ لمبی ڈاڑھی والا خانساماں جو خیر سے بہرا بھی ہے۔ مگر اس وقت اپنی چندھی بیوی کی آہستہ آہستہ باتیں کیسے مسکرا مسکرا کر سن رہا تھا۔ پھر بھی کیسی پرسکون ہے ان کی محبت۔ یہاں اتی جان اور بابا جان کے تو نرالے ہی ڈھنگ ہیں۔ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ جب آپا بن ٹھن کر جانے کے لئے موٹر مانگنے بابا جان کے کمرے میں کیسے معصومانہ انداز سے داخل ہوتی ہیں۔ گھبرائی گھبرائی سی آنکھیں بہانی خوب آتی ہیں —— حیران سی مسکراہٹ لئے —— بابا جان مجھے آج موٹر چاہئے۔ فلاں جگہ میٹنگ ہے۔ فلاں جگہ مشاعرہ ہے۔ آج کالج میں ڈبیٹ ہے۔ میں دیر سے آؤں گی ...... موٹر چاہئے —— گھبرائے رہتے اس وقت کتنی معصوم سی لگتی ہیں جیسے ڈرتے ڈرتے کسی بہت ہی اہم کام کو انجام دینا ہے۔ اور جس میں باپ کی اجازت ضروری ہو —— کیسی دغا باز ہیں اور جواب کے انتظار میں ساڑھی کے پلو کو انگلیوں سے

کیسے زور زور سے پٹختی ہیں جیسے ابھی پہاڑ ہی توڑ ڈالیں گی۔ اس وقت بابا جان مسکرا کر امی جان کو نظروں ہی نظروں میں نہ جانے کیا کہہ جاتے تھے ——— اور امی جان مسکرا کر ——— محبت سے آپا جان کی دل ہی دل میں بلائیں لیتی ہوں گی ———
اس وقت میں اور رخسانہ پردے کے پیچھے جل ہی تو جاتے تھے ——— جیسے بھڑ بھڑ کرتی ہوئی چھپٹیاں ہمارے سینے کے اندر جل رہی ہوں اور پھر دھیمے دھیمے جلنے لگتیں ———

خانساماں نے ایک بڑی سی لکڑی اور چولہے میں سرکا دی۔ آج منو کی ماں کتنی سردی ہے۔ ابھی آٹا گوندھنا ہے ——— خانساماں نے مسکرا کر طلبی انداز میں منو کی ماں کی طرف دیکھا ———

ہاں ہیں گوندھے لیتی ہوں۔ بیوقوف خانساماں کے دھوکے میں آ گئی ——— یہ مرد ——— ہر جگہ اپنی ہیکڑی جتاتے ہیں۔ بھلا کوئی پوچھے تو کر تم ہو ——— نام ہے میاں کماتا ہے ——— خانساماں گیری کرتا ہے۔ ایک وہ ہیں چیخوں مزے سے زندگی بسر کرتے ہیں مگر اس بہرے کو یہ خیال نہیں آیا کہ سردی ہے اور وہ بھی انسان ہے کیا آٹا گوندھتے ہوئے اسے سردی نہ لگے گی ——— سردی ——— مجھے بھی تو نہ جانے کتنی دیر سے لگ رہی تھی ——— مگر ——— کیا احمق پن ہے کہ باہر چپکی کھڑی ان کی باتیں سن رہی ہوں۔ ادھر آملیٹ بھی تیار کروانا ہے ——— خسانہ بھی اب شاید امید بھاگ گئی اللہ جیسے باغ میں

ذرگئی ہوگی اور پھر شاید سردی بھی لگ رہی ہوگی ——— اتنے مہینے چستر میں
بھی سرد سرد بگولے کلیجے میں کیسے لگتے ہیں ——— اور یہ دونوں ہماری لکڑیاں
کیسے بے دردی سے جلا رہے ہیں۔ کل ہی تو بابا جان نے نرسری سے کیکر کی سوکھی
ہوئی پتلی لکڑیوں کا تھیلا بھیجا تھا ——— اور یہ ان نازک نازک سوکھی
ہوئی ٹہنیوں کو کیسے جلا رہے ہیں۔ چرچر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چرچراتی ہوئی سلگ
رہی ہیں ——— سُنا ہے ——— سوکھی کھوکھلی لکڑی میں آگ
بڑی جلدی لگتی ہے ——— اور جب لگ جاتی ہے تو بجھتی بھی بڑی
مشکل سے ہے ——— وہ بھڑکنا جانتی ہے ——— سلگنا نہیں ———
اور گیلی لکڑ بار چاہے کتنا ہی جلاؤ سلگتی رہتی ہیں۔ بھڑ بھڑا کر نہیں جلتیں۔ ———
جیسے آپا جان۔ سوکھی لکڑی کیکر کی نازک سی۔ اور پڑھ پڑھ کر شاید کھوکھلی بھی ہوگئی ہوں
——— ذرا سی گرمی پہنچی اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رخسار سرخ انگارہ سے ہونٹ
جلتی ہوئی آنکھیں ——— پھر کہاں آپا جان، لگیں بھڑ بھڑ جلنے ——— چرچراتی
تک نہیں ——— اسی پر ماں باپ ہیں نہال نہال۔ اوفوہ۔ نہ جانے آپا جان
کو دیکھ کر مجھے کیوں جلن سی ہونے لگتی ہے۔ جیسے آگ سلگنے لگتی ہو۔ ۔ ۔
دھیمی دھیمی۔ جس کا دھواں دم گھونٹے دیتا ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چرچر ۔ ۔ ۔ ۔
روشنی اور بھی تیز ہو جاتی۔ چولھے کی پکی دیوار پر آگ کی روشنی سے خانساماں اور
خانسامن کے سائے اور بھی بڑے بڑے ہو جاتے۔ منہ چڑاتے ہوئے میلی کچیلی

دیوار پر سنہری سی روشنی پھیل جاتی۔ جس میں مکڑی کے جالوں میں چھپو لے چھوٹے مکڑیوں کے بچے بے خبر پڑے سو رہے تھے۔ آگ کی گرمی سے ——— ورنہ شاید باریک سے جال میں انہیں سردی سے نیند بھی نہ آتی . . . .

منو کی ماں۔ میں نے گرم پانی کر دیا۔ سے اب تو ذرا لگے ہاتھوں آٹا گوندھ۔ تو میں ذرا بیڑی پی لوں ——— ———

میں نے پھر ایک کر اینٹ کے چھوٹے سے ٹکڑے پر سے دیکھا۔ چندھی سی آنکھیں . . . . مسکرا رہی تھیں۔ ارے منو کے باپ تم نے کیوں گرم پانی کیا۔ کیا میں نے سردی میں کبھی کام نہیں کیا وہ مسکرا رہی تھی اس کا چہرہ اور بھی سرخ ہو گیا تھا۔ پانی آنکھوں سے اور بھی رسنے لگا۔ جیسے اب آٹے میں ٹپک ہی تو پڑے گا۔

اوہ۔ میں جھلا اٹھی۔ کمبخت کتنی گندی ہے۔ اس رسنے ہوئے پانی سے گندھے ہوئے آٹے کی ہم روز روٹی کھاتے ہیں۔ توبہ۔ میرا جی متلانے لگا۔ اب تو اندر جانا ہی پڑے گا۔

میں نے چپلوں کو زور زور سے مارتے ہوئے زمین پر چلنا شروع کیا۔

——— ارے آج پرور بی بی کیسے آگئیں؟ اور پھر اس سردی میں! خانسامن نے اپنی آنکھوں سے رستے ہوئے پانی کو میلی چادر سے پونچھتے ہوئے خوشامدی لہجے میں تیار ہے۔۔

ارے آپ نے منّو کی ماں کو آواز دے لی ہوتی اوپر سے۔ آخر یہ کس لئے ہے۔ اور وہ لطیف کہاں مر گیا ——— خانساماں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا ———

وہ موٹر صاف کر رہا ہے۔ جلدی سے آملیٹ تیار کرواؤ اور کھانا بھی بیگم صاحبہ کہیں باہر جانے والی ہیں۔ کھانا جلدی چاہیئے۔ میرے ہاتھ اب ہلکے ہو چکے تھے۔ بھاری سافرائی پان اب تیز تیز بھڑکتی ہوئی آگ کی لپٹوں میں گھرا ہوا تھا۔ جلتے ہوئے گھی میں انڈے کی زردی اور سفیدی اور گلابی گلابی پیاز کیسی شور مچا رہی تھی۔ چھن چھن، چھن چھن جیسے رات کے گیارہ بجے جاڑے کی خاموش راتوں میں جب گھر بھر بے خبر سو جاتا ہے اور اندھیرے کمرے میں چپکے سے ریڈیو کھول دیا جائے۔ اور اس وقت قسمت کی خوش نصیبی سے مدراسی آرکسٹرا بج رہا ہو۔ اور سب کی نیند کا خیال کرتے ہوئے والیوم بہت ہی کم کر دیں۔ اس وقت بالکل ایسی آوازیں کھنچی کھنچی سی آتی ہیں جیسے اس وقت فرائی پان میں سے آ رہی تھیں ——— انڈے کی زردی اب گول دائرے میں پھیل گئی تھی۔ جیسے چھوٹی سی ٹکیا ——— جس کے کناروں پر سفید لیس دار سا پانی پھول پھول کر بوڈر کی صورت میں جم گیا تھا ——— میں نے جھک کر کیکر کی ایک سوکھی ہوئی نازک سی ٹہنی چولھے میں جھونک دی ——— چٹ چٹ ——— ایک چھوٹی سی سوکھی ہوئی شاخ تھی۔ اور

بھڑبھڑ کرتی ہوئی خوب تیزی سے ٹہنیاں جلنے لگیں ——— جیسے آپا جلی بھنی جا رہی ہوں ——— مجھے خوشی سی ہوئی جیسے سلگتی ہوئی لکڑیوں پر کسی نے پانی ڈال دیا ہو۔ مگر اُف یہ کڑوا کڑوا دھواں دھیما دھیما ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جیسے سانس سا گھٹ رہا ہو ———

پھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جلدی آملیٹ لاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کتنی دیر لگا دی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپا سیڑھیوں پر کھڑی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چیخ رہی تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اونہہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں پھر سلگنے لگی ——— بڑی نواب زادی ہیں نا جو حکم چلا رہی ہیں۔ ہم ہی نوکر رہ گئے ہیں جو اس سردی میں رہیں اٹھ کر ——— اور وہ رخسانہ بھی مزے سے آتش دان کے پاس گرمی میں بیٹھی پڑھ رہی ہوگی ——— میرا بھی تو ٹیسٹ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے ہوش آیا ——— کتنی لاپروا ہوں ——— کل کیا خاک لکھوں گی جا کر وہاں ۔۔ بھاڑ میں جائے سب کچھ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ منو کی ماں تم دے جاؤ! اور کھانا بھی جلدی ——— چولھے میں بڑی تیز آگ جل رہی تھی ——— اور مجھے اس اندھیرے میں سردی میں ابھی اوپر جانا ہے ——— میں نے چیسٹر کو خوب لپیٹ لیا ——— اور تیزی سے سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ کتنی جلدی چڑھ گئی تھی ۔۔ ——— کمرے میں پردوں کے پیچھے کوئی سسکیاں لے رہا تھا ——— اندھیرے میں پردے کے پیچھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گرم گرم سا جسم ———

میں ڈر گئی ـــــ کون! رخسانہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ارے تم یہاں کیوں چھپی رو رہی ہو ـــــ

خاموش ـــــ اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔ اور کان کے پاس منہ لاتے ہی ان پر دوبارہ رقت طاری ہو گئی ـــــ

ارے کچھ کہو گی بھی۔ میں پھر سلگنے لگی ـــــ آپا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپا نے مجھے آج پھر ڈانٹا ـــــ پرویز بھیا کو ایک منٹ اکیلے نہیں چھوڑتیں جب وہ یہاں آجاتے ہیں تو ـــــ کالج میں تو نہ جانے کیا حال ہوگا کتابوں کی طرح بغل میں دبائے پھرتی ہوں گی ـــــ کہ کہیں ان کے شربتی آنکھوں والے کو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کوئی ان ہی جیسی بے صبری اچکا نہ لے اونہہ وہ غریب تو نھے سے دودھ پیتے بچے ہیں نا ـــــ اتنی بھی کیا محبت ۔ ۔ ۔ جو ٹپکی ہی پڑتی ہے۔ اور کوئی تو جیسے بھوکا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اونہہ اتراتی کس قدر ہیں۔ ابھی تو خیر سے شادی بھی نہیں ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ۔ پرویز کیسے۔ آپا کے سامنے آتے ہی کیسے بھیگی بلی بنے بیٹھے رہتے ہیں۔ نگاہیں تک نہیں اٹھاتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جیسے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ جانتے ہی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جہاں او جھل ہوئیں اور جیسے کینچلی بدل ڈالی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رخسانہ تم خاموش کیوں ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا خفا ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمہارے بال کتنے سنہری اور ملائم ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر میرے بالوں میں اپنی لرزتی ہوئی انگلیاں کس

بے تکلفی سے پھرنے لگتے ہیں ...... جیسے ان کا واسطہ اب شاید آپا سے پڑے گا ہی نہیں .... مگر آپا کی پرچھائیں نظر آئی اور کیسے بدل گئے جیسے یہ ہمیں جانتے ہی نہیں .... نہ جانے کیا عادت ہے .... اف اللہ ....

وہ بُری طرح ہانپ رہی تھی۔ اس کے تھمے ہوئے آنسو رخساروں پر بہنے لگے۔ میں حیران تھی کہ آخر آج یہ کیا بک رہی ہے۔ اس کے ہاتھ اور چہرہ کتنا گرم ہو گیا تھا۔ مجھے ڈر لگا شاید بخار نہ ہو گیا ہے ——— آخر تم کب تک اس پردے کے پیچھے کھڑی رہو گی۔ میں نے جل کر کہا۔ تم کو بہت تیز بخار ہو گیا ہے۔ شاید سردی لگ کر اور غصے سے بھی ———

غصہ! وہ حیران نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی کھلی ہوئی آنکھوں سے مجھے آگ کی گرمی محسوس ہوئی۔ چمکدار تیز آگ کی روشنی۔ جیسے باریک سیاہ پردوں کے نیچے آگ کے شعلے دہک رہے تھے۔ سچ مچ سلگ رہی تھی بیچاری مجھے رحم آ گیا ——— ساتھ ہی مجھے اپنا بھی خیال آیا ——— مجھے بھی نوکر سمجھا تھا۔ اتنی سردی میں نیچے خانساماں کے پاس بھیجا۔ پرویز کے بچے کے لئے آملیٹ بنوا لاؤ۔ جب تک ان کے حلق سے دو تین سالن نہ اتریں کھانا تھوڑی کھا سکتے ہیں۔ نواب زادے ...... ہم دونوں اپنے کمرے میں لیمپ کی روشنی میں سلگ رہے تھے۔ سردی میں ———

امی جان، بابا جان سینما نائٹ شو گئے ہوئے تھے ——— اتنے بڑے گھر میں ہم دونوں اکیلے کمرے میں سلگتی ہوئی آگ آنسوؤں سے بجھا رہے تھے۔ آتشدان پہ آپا جان اور پرویز بھیا نے قبضہ کر رکھا تھا۔ اب میں سمجھی رخسانہ۔ میں نے جلتے ہوئے کہا۔ تم کو کیوں اٹھایا تھا وہاں سے۔ کیونکہ ان کو بھی سردی لگ رہی تھی اور تم کو وہ اٹھانا چاہتے تھے سمجھیں.....

رخسانہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ڈرائنگ روم سے آپا کی دبی دبی ہنسی کی آواز آ رہی تھی۔ میرا دل دھڑکنے لگا ——— شاید رخسانہ کا بھی دھڑک رہا ہوگا۔ مگر چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ میں نے اشارہ سے کہا۔ چل دیکھیں۔ اس نے سر ہلا دیا نہیں۔ ——— اوہو ——— جب سے جناب چھپی کھڑی تھیں پردے کے پیچھے اور اب میں نے جب کہا تو ——— نخرہ۔ جاؤ.........

میں نے چپکے سے پردے میں سے جھانکا۔ آتشدان میں خوب تیزی سے سوکھی ہوئی کیکر کی لکڑیاں جل رہی تھیں ——— بھڑ بھڑ ——— نیلی شال اوڑھے چمک رہی تھیں۔ سرخ رخسارے۔ انگارہ سے کانپتے ہوئے ہونٹ۔ جلتی ہوئی آنکھیں۔ اور یہ کمبخت پرویز بھیا کس غضب کے خوبصورت لگ رہے تھے۔ نیلے سوٹ میں سرخ چہرہ ——— آگ کی روشنی میں سا سرخ ہو گیا تھا ——— بھوری بھوری آنکھیں۔ جیسے اب رو دی

دیں گے۔ ابھی تو خاصے ہنس رہے تھے دونو ــــــــ مگر اب کیا ہو گیا جیسے
اب دونوں چیخیں مار کر روئیں گے۔ مجھے ڈر لگنے لگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اکیلے ٹھیک
نہیں۔ میں آہستہ سے رخسانہ کے پاس آ گئی۔ کیسی بے خبر کرسی پر ٹانگیں چڑھائے
کہنیاں میز پر ٹیکے کتنے غور سے جلتے ہوئے لیمپ کو دیکھ رہی تھی۔ رخسانہ رخسانہ
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ چونک پڑی۔ کیا ہے وہ حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ خالی
خالی نظریں ــــــــ حیران گھبرایا ہوا معصوم سا چہرہ ــــــــ میں ہنس
پڑی۔ پگلی کیا ہوا تجھے ــــــــ ؟

"کچھ بھی نہیں" وہ اپنی گھبراہٹ چھپاتے ہوئے بولی۔

تو چلو آپا کو دیکھو۔ کیسے بیٹھی ہیں۔ نیلی نیلی شال میں سفید سا ماتھا سرخ
سے رخسار عنابی ہونٹ، کالی کالی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں۔ سیاہ چمکدار
بال۔ کیسے کمر پر بکھرے ہوئے ہیں۔ اور دیکھنا رخسانہ میں سردی سے مجبور ہو کر
اس کی کرسی میں ٹھس گئی۔

دیکھنا رخسانہ پرویز بھیا بھی آتے تو بصورت معلوم ہو رہے ہیں کہ ۔ ۔
میں کیا بتاؤں۔ میں نے حلق کا پانی نگلا۔ ان دونوں کو کیسے معلوم ہو جاتا ہے۔
جب دیکھو ایک رنگ کے کپڑے پہنتے ہیں۔ رخسانہ تعجب سے بولی ــــ
اس میں کیا بات ہے۔ ایک روز پہلے کہہ جاتے ہوں گے ــــــــ

ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ پھر خاموش نظروں سے جلتے ہوئے لیمپ

کو گھورنے لگی ——— اوہو . . . . یہ اتنی لمبی۔ ہوں کس سلسلہ
میں۔ میں نے منہ چڑاتے ہوئے رخسانہ کو دیکھا۔ مگر وہاں صرف سنجیدہ مسکراہٹ
کے سوا کچھ نہ تھا۔ توبہ میرا دل گھبرانے لگا۔ یہ کیا مصیبت ہے۔ جو ہے وہ رو دیئے
دیتا ہے ——— منحوس شکلیں۔ چلو آپا اور پرویز بھائی کو دیکھیں ———
ادھر کیا دیکھیں . . . . وہ جھلائی . . . . بہت دیکھ لیا۔ پرویز بھیا
. . . . آپا کو بھی بہت کچھ دیکھ لیا پرویز بھیا ——— کی سفید سفید انگلیاں ———
آپا کے سیاہ چمکدار بال کمر پر بکھرے ہوئے ——— وہ ایک دم خاموش
ہو گئی۔ جیسے نیند میں بڑبڑا رہی تھی۔ حیران نظریں چلتے ہوئے لیمپ پر جمی ہوئی
تھیں۔ پتھرائی سی میں حیران سی کھڑی تھی۔ شاید اسے معلوم نہ تھا کہ میں اس کے
پاس کھڑی ہوں وہ پھر بڑبڑائی۔ ارے آپا کی طرح یہ بھی . . . . سوکھی کھوکھلی
کیکر کی ٹہنی ہے۔ وہ چڑچڑائی۔ اور رخسار سرخ ہو گئے۔ ہونٹ انگارہ سے ہو گئے
جلتی ہوئی آنکھوں سے پانی رسنے لگا۔ موٹے موٹے آنسو جلتے ہوئے . . . . . .
نہ جانے کیوں۔ میں بھاگی ہوئی پردے کے پیچھے گئی۔ مگر آتشدان کے پاس
اب کوئی بھی نہ تھا پرویز بھیا چلے گئے تھے آگ مدھم پڑ گئی تھی۔ میں آہستہ آہستہ
آتشدان کے پاس پہنچ گئی۔ آپا کے کمرے کی بتی جل رہی تھی اور دروازے بند
تھے۔ آپا کے کھانسنے کی آواز آہستہ آہستہ دروازوں سے ٹکرا رہی تھی ———
مجھے سردی کا پیر ورسے لگی۔ میں اکیلی آتشدان کے پاس بیٹھ گئی۔ سوکھی ہوئی کیکر

کی ٹہنیاں آگ میں سرکا دیں۔ بھڑ بھڑ ... ۔ ۔ ۔ ۔ وہ پھر تکنے لگیں۔ چھوٹی چھوٹی ٹہنیاں چرچرائیں۔ اور پھر خوب تیزی سے آگ جل رہی تھی ... ۔ ۔ ۔

چرچر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کس قدر رنگین ہے راہِ محبّت کا فریب

"قلی یہ سامان اتارو"

وہ حیران سی کھڑی تھی۔ لاہور کے خوبصورت اور زندگی سے لبریز اسٹیشن پر ٹہلتے ہوئے بے فکر چہرے اس کی ہوا سے لہراتی ہوئی سیاہ نقاب میں سے جانے کیا چیز ڈھونڈھنا چاہتے تھے۔ قلی اب سارا سامان پلیٹ فارم پر رکھ چکا تھا۔ اس کا دل نہ جانے کیوں دھڑکنے لگا ہائے خالہ جان کو شائد میرا تار نہیں ملا۔ اور آج کل تو راحیل بھیا کی بھی چھٹیاں ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ راحیل ۔ ۔ ۔ ۔ بھیا ۔ ۔ ۔ وہ یونہی کچھ جھینپ سی گئی۔ میں بھلا بھیّا کیوں کہوں۔ کتنا چڑتے ہیں بھیا کہنے سے۔ اتنا نہیں سمجھتے ہیں کوئی سچے دل سے بھیّا تھوڑا ہی کہتی ہوں سعید

سفید سرخی مائل مسکراتے ہوئے تین چہرے اس کے بالکل قریب سے نکلے اتنے قریب کہ ان کے کپڑوں کی سرسراہٹ کو اس کے دھڑکتے ہوئے دل نے بھی محسوس کیا بھینی بھینی سینٹ کی خوشبو سیاہ چمکدار شریر سی ناچتی ہوئی آنکھیں ـــــ شربتی سنہری چمکدار سی آنکھیں ـــــ بھوری بھوری سی' اس نے اپنے سیاہ برقع کی باریک جالی میں سے کتنے قریب سے دیکھا تھا۔ کتنی خوبصورت آنکھیں تھیں۔ کس قدر دلکش، جیسے کسی اطالوی مصور کے شاہکار کی آنکھیں۔ جیسے کسی نے ملائم بھورے چمکدار ریشم کو موتیوں کی آب میں بھگو دیا ہو۔ ـــــ ہائے اللہ کتنی خوبصورت آنکھیں تھیں ـــــ اونھ ـــــ وہ پھر گھبرانے لگی ـــــ آخر خالہ جان نے کسی کو بھی لینے نہیں بھیجا ـــــ کیوں؟ کیا میرا تار نہیں ملا ـــــ؟ گھڑی دیکھی۔ نو بج کر پچھہتر منٹ ہوئے تھے ـــــ آج تو گاڑی بھی لیٹ نہیں آئی۔ اس نے سوچا۔ جو کوئی انتظار کر کے جا چکا ہو ـــــ وہ گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔

قلی سامان اٹھا لو ـــــ ہلو ـــــ ہلو صبیحی ـــــ وہ صرف برقع میں مسکرادی الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔ نہ جانے کیوں دل اور بھی زور سے دھڑکنے لگا۔

ٹن ٹن ٹن ٹن ـــــ اس نے گننا شروع کیا۔ بارہ بج گئے
اور پھر گرمیوں کی تاروں بھری راتیں۔ جو بہت سے پارساؤں کو
آزما چکی ہوں ـــــ پھر ان غریب ناسمجھ لڑکیوں کو تڑپا دینا تو
ان شریر ستاروں کا محبوب مشغلہ ہے ـــــ اور وہ چمکتا ہوا گول
مول سا ٹھنڈا ٹھنڈا چاند جو کتنی ہی جلتی ہوئی آنکھوں کو کم سے کم تھوڑی
دیر کے لئے ٹھنڈک پہنچا دیتا ہے۔ لیکن آنکھوں کو جہاں چاند کی ٹھنڈک
نصیب ہوئی نہ جانے اس کی آنکھوں کی نیند کون اڑا کرلے گیا تھا کروٹیں
بدلتے بدلتے اس کا بدن دکھنے لگا تھا ـــــ اس کا دل بری طرح
مچل رہا تھا۔ آج اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے دنیا نے اب تک
اسے بیوقوف بنایا ہے۔ صبح کے نو بجے سے رات کے بارہ بجے تک
اس لمبے چوڑے گھر کے سبھی لوگوں نے تو اس سے جی بھر کے باتیں
کرڈالیں خالہ جان نے تو غضب خدا کا سر میں درد ہی کر کے چھوڑا امی
کے بارے میں سارے جہان کی باتیں پوچھ ڈالیں۔ مگر اس کے دل میں
ایک ہلکی سی جستجو مچل رہی تھی۔ زمانہ کس طرح بدل جاتا ہے۔ راحیل ـــ
وہ راحیل جو دو دو گھنٹے اپنے کالج کی لڑکیوں کے بارے میں فضول فضول
سے قصے سنایا کرتا تھا۔ جو کبھی باتیں کرتے تھکتا ہی نہیں تھا ـــــ اور
وہ بھی ہمیشہ بڑی دلچسپی سے سنا کرتی تھی ـــــ اس کی نگاہیں کبھی کبھی

اس کی حیران نگاہوں سے الجھ کر رہ جاتیں۔ ہونٹ تھرتھرانے لگتے۔ اور
دل بے اختیار دھڑکنے لگتا ــــــــ وہ کچھ جھینپ سی جاتی اور نظریں
نیچی کر کے پھر سننے لگتی۔ اس کی انگلیاں اس وقت کتنی کمزور سی ہوجاتیں
ذراسی چکدار بننے کی سلائیاں بھی نہ سنبھال سکتیں۔ پھر بھی وہ چاہتی تھی
کہ وہ فضول سے قصے سناتے ہی رہیں۔ جب تک کہ کھانے کا وقت نہ
آجائے۔ مگر آج صبح سے اس نے صرف تین فقرے ادا کئے۔ جو اب
تک اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ کتنی اکتاہٹ تھی ان جملوں میں
ہلو صبیحی ــــ صبیحی پیچھے بیٹھو ــــ کچھ بھی نہیں بول تو رہا ہوں
.... اور پھر وہی حیران سی آنکھیں۔ مغرور سا چہرہ۔ اس وقت
اسے رونا سا آگیا تھا ــــ جب وہ کار کے قریب آکر اگلی سیٹ
پر بیٹھنا چاہتی تھی۔ اسے اگلی سیٹ بہت پسند تھی خواہ اسی ڈرائیور
کے پاس ہی بیٹھنا پڑے۔ اور جب بھائی جان ڈرائیو کرتے تھے تو
بھابی جان سے کتنی دفعہ اس کی لڑائی ہوتے ہوتے بچی تھی مگر جیت
اسی کی ہوتی اور وہ اگلی سیٹ پر بیٹھتی۔ مگر راحیل نے کیسے تیز لہجہ میں
کہا تھا۔ صبیحی پیچھے بیٹھو ــــ اور وہ شرمندہ سی ہو کر پیچھے نرم
نرم گدے پر گر پڑی تھی۔ موٹر سنسان سی سڑک پر کس تیزی سے
راستہ طے کر رہی تھی ــــ راحیل ڈرائیو کر رہا تھا۔ سنسان

سی سڑک۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے۔ نرم نرم گدوں میں نڈھال سا دھنسا ہوا جسم ——— جو موٹر کی تیز رفتار سے کبھی کبھی دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ خود ہی اچھل پڑتا۔ ایک لطیف سے ہچکولے کے ساتھ ——— راستے میں راحیل نے کوئی بھی بات نہیں کی ——— اس کے دل میں میٹھی میٹھی شکایتوں میں ڈوبی ہوئی جلن سے محسوس ہونے لگی۔ آنکھوں میں آنسو مچل کر رہ گئے۔ وہ پلنگ پر پڑی کروٹیں بدلتی رہی۔ اس کا جی چاہا کہ اس چاند کی پھیکی پھیکی زرد روشنی میں چپکے سے باغیچے کی طرف نکل جائے جھولتی ہوئی ننھی ننھی ٹہنیوں میں اپنی باہیں لپیٹ دے۔ کھلے ہوئے چمپا کی بھینی بھینی خوشبو سے مست ہو جائے۔ اور اس ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں خود کو بہنے دے۔ نرم نرم کھلے ہوئے پھول کی کچھ سفید کچھ پیلی پیلی پتیاں۔ جیسے خوف سے سفید چہرہ زرد ہو گیا ہو۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اس نرم نرم ٹھنڈی ٹھنڈی پتیوں کو اپنے گرم گرم رخساروں پر ہلکے ہلکے پھیرے۔ گرم گرم ہونٹوں میں پھول کی ٹھنڈی ٹھنڈی کھلی ہوئی پتیوں کو آہستہ آہستہ کھینچ کر توڑ ڈالے اور جب کھلی ہوئی پتی اس کے ہونٹوں پر چپک جائے تو وہ گرم گرم سانسوں کے ذریعہ اسے کمہلا دے اس کا میٹھا میٹھا ——— ایسا

میٹھا۔ جس میں کچھ تلخی بھی ہو رس چوس لے اور پھر اسے مروڑ کر دانتوں سے بالکل ہی مسل دے۔ کتنا مزا آتا تھا۔ اسے اس کھیل میں خواہ مخواہ اگر کچھ کام نہ ہو تو فضول گھومتے ہوئے کمرے میں خوبصورت گلدانوں کے کھلے ہوئے خوشبودار پھولوں کی تو پھر خیر نہیں۔ اور گلاب کی نازک پنکھڑیاں تو حلق سے باہر آتی ہی نہیں۔ بکریوں کی طرح چبا جاتی تھی۔ مگر اس وقت نازک نازک خوشبودار پھول کہاں ٹھنڈا سا لمبا چوڑا بستر کسا ہوا پلنگ اسے نفرت سی ہونے لگی تھی۔ اس جگہ سے۔ وہ خود بھی حیران تھی۔

آج اس خوبصورت سی کوٹھی میں ساری دلچسپیوں کا سامان موجود ہے اور پھر راحیل کی قربت بھی حاصل ہے یہی نہیں بلکہ اس کا پلنگ اس کے پلنگ کے بالکل قریب ہی ہے۔ مگر پھر بھی وہ اس سے کوسوں دور ہے اور ان دونوں کے درمیان ایک ایسا فاصلہ حائل تھا جسے آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں ــــ ٹن ٹن ــــ گھڑی نے دو بجائے اور وہ سوچنے لگی کہ آخر وہ کب تک یونہی جاگتی رہے گی۔ نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی۔ گرم گرم آنکھیں جن میں جلن سے ہو رہی تھی۔ ان میں اب چبھن سی محسوس ہونے لگی۔ وہ اکتا کر پھیکے پھیکے زرد چاند کو دیکھنے لگی جس سے میں ٹھنڈی ٹھنڈی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ اس کی جلتی ہوئی آنکھیں تھوڑی دیر کے لئے ٹھنڈک سی محسوس کرنے لگیں۔ رفتہ رفتہ اس کی

آنکھیں خود بخود بند ہوتے لگیں ــــ ٹھنڈا ٹھنڈا سفید گداز سا تکیہ اس نے اپنے گرم گرم سرخ ہاتھوں میں مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔ جیسے کسی معصوم بچے کو خطرے سے بچانے کے لئے اس اپنے سینے سے چمٹا لے۔ چہرہ پر بے چینی اور پریشانی سی تھی۔ پیشانی پر ہزاروں بل سے پڑ گئے تھے۔ گلابی گلابی ہونٹ آپس میں ملے اور پھر الگ ہو گئے۔ آخر یہ بے رخی کیسی ــــ اس کے ہاتھوں میں تکیہ دبا ہوا تھا۔ وہ پھر بڑبڑائی صبح سے اب تک آواز کو ترس گئی ــــ تم کیوں ناراض ہو۔ راحیل خدا کے لئے جواب دو ــــ وہ زور سے تکیہ کو جھنجوڑنے لگی۔ جواب دو راحیل کیا تم مجھ سے خفا ہو۔ آخر کیا وجہ ہوئی۔ کیا تم اپنے وعدوں کو بھول گئے۔ تم کتنے بدل گئے۔ تمہارے جملے ابھی تک مجھے یاد ہیں۔ جب تم ایم۔ اے کرکے لاہور جا رہے تھے۔ اور تم نے ــــ بارش میں اندھیری سی شام میں بھیگے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ــــ بجلی کیسی غضب کی چمک رہی تھی۔ اس طوفانی شام میں تم میرے پاس آئے تھے۔ تمہارے سیاہ سے بال جن پر پانی کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ سفید چمکتی ہوئی پیشانی پر پریشان سے تھے۔ تمہارا چہرہ کتنا سرخ تھا۔ اس سردی میں تمہیں پسینہ آ رہا تھا اور تم نے کتنی عاجزی سے کہا تھا صبیحی کل میں جا رہا ہوں۔ کیا تم خط لکھو گی ــــ؟ اور پھر ــــ پھر تمہاری آنکھوں میں نہ جانے کیوں آنسو تڑپ رہے تھے

چمکیلا پانی پلکوں پر آکر ٹھہر گیا تھا ـــــ تمہارے ہاتھ کانپ رہے تھے ـــ تمہاری نگاہیں میرے پیروں پر جھکی ہوئی تھیں۔ تم کتنے گھبرائے ہوئے سے تھے۔ معصوم سا چہرہ ـــــ حیرت بھری سیاہ سی آنکھیں ـــ تم نے رکتے ہوئے ـــــ آہستہ سے کہا تھا۔ "صبیحی تم مجھے بھول سکتی ہو ـــــ لیکن شاید میں تمہیں نہ بھول سکوں تمہارے ہونٹ کانپ رہے تھے ـــــ تمہاری کانپتی ہوئی سفید سی انگلیاں ٹیبل لیمپ کے نازک سے پیاری شیڈ پر یونہی سی تھر تھرا رہی تھیں۔ تم کتنے بدحواس تھے ـــــ لیمپ کی تیز روشنی میں تمہاری . . . . سیاہ چمکیلی بیقرار نگاہیں سرخ پسینے سے تر چہرہ سرخ کانپتے ہوئے ہونٹ . . . . . . تم کتنے بے چین تھے تم نے سر جھکائے ہوئے کہا تھا۔ "صبیحی تم چاہے خط نہ لکھو مگر میں ہمیشہ انتظار کروں گا۔ کیا تم لاہور نہیں آؤ گی . . . . راحیل جواب دو . . . . میں کتنے ارمان لے کر یہاں چھٹیاں گذارنے آئی۔ تم کس قدر بدل گئے راحیل میں صرف تمہاری خاطر یہاں آئی . . . . . . راحیل بولو . . . . جواب دو . . . . .

اس کی آواز آہستہ تر ہوتی گئی۔ زرد پھیکے پھیکے چاند نے اور بھی اداس ہو کر سیاہ چادر سے اپنا منہ ڈھک لیا . . . . ٹھنڈی ٹھنڈی ہواہیں اس کے سیاہ بال اس کے رخساروں کو چوم رہے تھے اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ بند آنکھوں کی پلکوں میں چمکتے ہوئے آنسوؤں کے قطرے چمک

رہے تھے۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔

سب ہی تو حیران تھے، آخر صبیحی پرسوں تو آئی اور آج ہی جا بھی رہی ہے کیوں؟ ۔ ۔ ۔ کس لئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ خیر تو ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وہ جواب دیتے دیتے تھک گئی تھی۔ مگر وہ خود بھی معقول جواب نہ دے سکی کیوں آئی تھی۔ کیوں جا رہی ہے۔ کچھ بھی نہیں خالہ جان وہ اکتا کر کہتی ایسے ہی دل نہیں لگتا ادئی بچی ایسا بھی کیا دل۔ ابھی آئی کو کون سے دن گزرے جو جانا بھی ہو گیا ——— کم سے کم آٹھ دن تو ٹھہرتیں۔ ۔ ۔ ابھی کے دن کٹے رات ———

نہیں خالہ جان میں اب نہیں ٹھہروں گی۔ وہ اکتا کر کہہ رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ نے خوب زور زور سے ——— کم بخت کپڑے بھی بکس میں نہیں آسکے۔ وہ بیزار سی ہو گئی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ صدی کو پکڑ کر خوب پیٹے ——— آخر اس نے کیا کیا مگر نہ جانے اسے کیوں ایسا محسوس ہو رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ جیسے جیسے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی ساری کائنات جس کو اس نے چھپا چھپا کر اب تک اپنے دل کے گوشے میں رکھا اس کو صدی نوچ رہی ہے چپکے چپکے کھینچ رہی ہے اور اب عنقریب چھین لے گی۔ کوئی خاص بات بھی نہ تھی۔ گھر کی چھوکری سیاہ آنکھوں والی سانولہ سا رنگ پھٹے

ہوئے میلے سے کپڑے . . . مسکراتے ہوئے لب تھرتھراتے ہوئے مگر چہرہ پر ایک قسم کا خوف سا ـــــ ہر ہچکولے سے ڈر جانے والی مگر نہ جانے اسے کیوں وہم سا ہو گیا تھا۔ مگر ہاں ـــــ وہ اس چیز کو نوٹ کر رہی تھی صبح چائے پر تو اس کا شک یقین تک پہنچ گیا تھا ـــــ جب راحیل نے چیز کا ڈبہ الماری میں سے صدی سے نکلوایا تھا۔ اور دیتے وقت اس کی لمبی لمبی پیلی سی کانپتی ہوئی انگلیاں سفید سفید سخت انگلیوں سے ٹکرا گئی تھیں ـــــ

سانولا چہرہ بوسیدہ میلی چادر میں سرخ پڑ گیا تھا۔ مسکراتے ہوئے لبوں سے سفید دانت جھانک رہے تھے ـــــ اور سرخ وسفید چہرہ پسینہ میں تر ہو گیا تھا ـــ ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس کا دل جیسے ڈوب رہا تھا۔ چائے کی پیالی جیسے گرتی گرتی بچی ـــــ اس کا جی چاہا کہ ـــــ ابھی سیدھی اُٹھ کر اسٹیشن چلی جائے مگر ـــــ مجبور تھی۔ صدی صدی گھر کی چھوکری ان پڑھ بیوقوف سی چھوکری۔ اس کی پوشیدہ محبت کو چھین رہی ہے ـــــ اسی محبت کو جو اس نے چھپا چھپا کر ہمیشہ۔ اپنے دل میں رکھا وہ راحیل کو کس قدر چاہتی تھی۔ مگر کبھی اس نے راحیل پر ظاہر ہی نہیں کیا ـــــ

اپنی چیزیں جمع کرتے کرتے وہ تھک گئی تھی۔ کپڑوں کے ڈھیر

میں سے اس کو نرم گرم سا عنابی رنگ کا ملائم سیاہ سوئٹر نظر آیا ـــــ وہ کتنی جلدی بھول گئی تھی۔ کس شوق سے اس نے راحیل کے لئے سوئٹر بنا تھا ـــــ اور ساتھ لائی تھی کہ اسے دے گی اپنی نشانی۔ تاکہ دور رہ کر بھی وہ اسے نہ بھول سکے ـــــ مگر راحیل نہ جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔ اس سے تین روز میں صرف دو دفعہ بولا ـــــ کتنے اکتائے ہوئے جملے تھے ....
اس کے سینے میں ایک قسم کا درد سا ہونے لگا اور پلکوں میں سفید سفید آنسوؤں کے قطرے کانپ رہے تھے ـــــ وہ ایک دم مسکرا اٹھی جانے سے پہلے ایک دفعہ پھر وہ راحیل سے مل لے شاید وہ روک لے۔ شاید وہ سوئٹر دیکھ کر خوش ہو جائے۔ وہ بھاگی ہوئی سوئٹر کو سینے سے چمٹائے ہوئے راحیل کے ـــــ کمرے میں آہستہ آہستہ داخل ہو گئی۔ پردا اٹھا کر وہ ٹھٹک گئی ـــــ نرم نرم صوفے پر بسیدو میلے کچیلے دوپٹہ میں لپٹا ہوا جسم سیاہ حیران سی نگاہیں سانولا سا چہرہ سرخ و سفید چہرے پر جھکا ہوا تھا۔ سرخ چہرہ پسینہ میں تر تھا۔ سرخ ہونٹ کانپ رہے تھے ....
کھڑکی کے بند دروازے کے ایک سوراخ سے سورج کی ننھی ننھی شعاعوں میں دو چہرے چمک رہے تھے ـــــ صدی ـــــ اس کا حلق خشک ہونے لگا ـــــ ہاتھ پاؤں جیسے سن ہو گئے تھے۔ سینے سے چمٹا ہوا سوئٹر اس کے پیروں میں پڑا ہوا تھا۔

نین ہین کو راہ دکھاؤ

نیناں رے ———— دیکھے ان کے نین . . . . . تا . . . . بسنت ان میں بہاران ہیں، جیون کا رس سنگھار، دنیا بھر کا چین . . . . نیارے دیکھے ان کے نینا . . . . . .

خورشید کا یہ ریکارڈ نہ جانے کب سے صلّو بجا رہی تھی۔ نہ جانے کیا جادو ہے اس آواز میں، میں اندھیرے ڈرائنگ روم میں صوفے میں دھنسی پڑی تھی . . . . شام تاریک ہوتی جا رہی تھی . . . . . آج نہ جانے شام کیوں اتنی اداس ہے۔ میں اتنی بیچین کیوں ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ میں یہی سوچ رہی تھی۔ آنکھیں روتے روتے جلنے لگی تھیں ———— نہ جانے کیوں، مرنے کو جی چاہ رہا تھا ——

مجھے کھانسی اٹھنے لگی۔ مگر دوپٹہ ٹھونس لیا۔ کیونکہ خالہ جان سنتے اگر سن لیا کسی کمرے سے تو ڈانٹ پڑے گی۔ تم ابھی تک سیر کرنے کیوں نہیں گئیں ——— اونھ اب جب مجھے زندگی کی منزل بہت جلدی ختم کرنی ہے۔ اس وقت سب کو فکر ہوا۔ اب سب کو ہمدردی پیدا ہوئی۔ کہ دنیا کی سیر کئے بغیر نہ چلی جائے۔ دنیا کی سیر۔ جہاں ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے مدہوش سے جھونکے بے ہوش کر دیتے ہیں خوشنما چمکتے پھول اپنی خوشبوؤں سے ہر ایک کو کھینچ کھینچ کر اپنے پاس بلاتے ہیں جب پھول کوئی توڑنا چاہیں تو نرم نرم خوشنما ٹہنیوں کے نیچے نوکیلے کانٹے ایسے چبھتے ہیں۔ جن کی کسک . . . . عمر بھر رہتی ہے۔ اور آخری منزل پر بھی کانٹے ہی الوداع کرتے ہیں۔

کانٹے ——— اور انہی کانٹوں کی تعریف، ہے بسنت ان میں، بہار ان میں، دنیا بھر کا چین۔ خورشید گا رہی تھی۔ درد بھری آواز میں کانٹے کی چبھن سے بے تاب ہو کر . . . . . میری عزیز صلو معصوم پیاری سی بہن۔ مجھے ڈر ہے یہ کیوں اس ریکارڈ کو آج بجائے چلی جا رہی ہے سوچتے ہی روح کانپ جاتی ہے۔ اور میری زندگی کو چھیدتا ہوا کانٹا جو اب تھوڑے دنوں میں پار نکل جائے گا۔ پھر آج چبھنے لگا۔ کیسی چبھن ہے، کہ آنسو تک ساتھ آجاتے ہیں۔ یہ قہقہے لگاتی ہوئی صلو نے

بھی کہیں مہکتا ہوا پھول تو نہیں توڑ لیا ـــــــ آخر یہ اس اُداس شام میں اپنے کمرے میں بیٹھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آج ریکارڈ بجائے جا رہی ہے۔ بالکل میری طرح جنونی حالت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں بھی کبھی قہقہہ لگانا جانتی تھی۔ میری زندگی میں بھی ایک چلبلاپن تھا۔ دنیا کی سیر کرنے کی کی خواہش۔ ایک نیاپن میں اپنی زندگی میں ہمیشہ محسوس کرتی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ یہ اس سے پہلے جب میں نے ایک ریکارڈ کو چار پانچ دفعہ ہی بجایا تھا یہ اس سے پہلے جب میں اپنی زندگی کو گرتے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔ سہارا ڈھونڈنے کے لئے میری آنکھیں حیران سی، جنہیں پھٹی پھٹی سی۔ مگر نہ جانے باریک باریک سے پردے نیلے سے سیاہ سے میرے چاروں طرف کیوں پڑ گئے تھے۔ جن میں سے میں صرف چمکتے ہوئے چاند کو دیکھ سکتی تھی۔ ننھے ننھے تاروں کو دیکھ سکتی تھی۔ مہکتے ہوئے پھولوں کو حاصل کرنے کے تصورات میں ساری راتیں جاگ کر گذار دیتی۔ میری آنکھیں اور بھی سرخ اور پھٹی پھٹی سی ہو جاتیں، کھلی کھلی حیران سی آنکھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کانٹا زور سے پھر چبھا۔ اس کی چبھن آنکھوں سے آنسو کھینچ لائی ـــــــ میری کمر دکھنے لگی اور کھانسی پھر زور سے اٹھنے لگی۔

خالہ جان کا ڈر ـــــــ ڈاکٹروں کا حکم ـــــــ ٹی بی ـــــــ

تازہ ہوا ـــــ احمق ڈاکٹر، کوئی کیا جانے زندگی کے چھلنی کرنے والے کانٹے کو نکالنا چاہتے ہیں۔ کن سے، نرم نرم ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکوں سے ـــــ انہیں کیا معلوم ۔۔۔۔۔ یہ صبح شام کی سیر، جب ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا مدہوش کر دیتی ہے ۔۔۔۔۔۔ نرم نرم تھپکیوں سے کانٹے زندگی کو چھیدتے باہر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں ـــــ اس وقت ۔۔۔۔۔ زندگی ہچکولے کھانے لگتی ہے ـــــ سسکتے ہوئے منزل کا سرا ڈھونڈنے لگتی ہے۔ اس وقت اندھیرے میں اسے روشنی کی ضرورت پڑتی ہے ـــــ جیسے کہ مجھے آج ۔۔۔۔۔۔۔ اسی تاریک لمبے چوڑے ہال میں کتنی تاریکی ہے ـــــ اندھیرا ـــــ سائیں سائیں کرتی ہوئی میری طرح درماندہ ہوائیں ـــــ دم توڑتی ہوئی۔ بےچین۔ کسی کے لئے مضطرب ـــــ کون ۔۔۔۔۔ وہی پھول ۔۔۔۔۔ جس کی تر و تازگی دیکھ کر، جس کا معصوم حسن دیکھ کر ـــــ جس کی مہکتی ہوئی خوشبوؤں نے مجھے بلایا تھا ـــــ جس نے میری آنکھوں میں ٹھنڈک بھیجدی تھی۔ بالکل نرم نرم ٹھنڈی پتیوں جیسی جن کو میں نے اپنی گرم گرم جلتی ہوئی آنکھوں پر پھیرا تھا ـــــ اس حسین سے پھول کو میں نے نادانی میں اپنا سمجھ کر اس کو پیار سے بھینچنا چاہا تھا ـــــ آف ـــــ نرم نرم

پتیوں میں پوشیدہ کیسے نوکیلے نوکیلے باریک کانٹے تھے ——
جن میں سے ایک تو اب میری زندگی کو ختم کرنے والا ہے ——
یہی کانٹا میری زندگی کا اب راہ بر ہے ابھی یہ میری زندگی کو اس
کی دوسری منزل تک لا سکا ہے —— آسانی سے' میں خاموشی
سے چلی آئی خود ہی۔ تصورات کی دنیا سجائے —— وہی خوبصورت
سی دنیا تھی —— پھولوں سے بھری ہوئی۔ جس کی مہک مجھے
مدہوش کئے ہوئے تھی۔ کسی کو خبر بھی نہ ہوئی کہ میں نے . . . . .
میری زندگی نے اس عزیز ترین ساتھی کے تحفہ کو کیسے سینے میں
جگہ دی —— مگر اب میں خود نڈھال ہو گئی ہوں۔ یہ آخری اور
تیسری منزل اب میں دنیا کی نظروں میں ان کے کندھوں کے سہاروں
سے طے کر سکوں گی —— پھر شاید یہ کانٹا جس کی نوک میرا خون
چوس چوس کر موٹی ہو گئی ہے —— جس نے میرے جسم کا خون چوس
چوس کر خود بھی کہیں کانٹا بنا دیا ہے ایک دفعہ ہی ماضی کے پردے
چھلنی چھلنی کر دے گا —— بھدے بھدے سے سوراخ ——
جیسے میری زندگی۔ چھلنی کی طرح —— جن کے آر پار اب مرے سے
ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے . . . . . ہوئے ہوئے صرف
جھنجھناتے چلے جاتے —— جیسے ٹوٹے ہوئے ساز پڑے بھدے سے

کوئی انگلی پھیر دے۔ بے سُرے تار صرف جھنجھنا اٹھیں گے۔ اور پھر چاروں طرف خاموشی چھا جائے گی ——— میرے نرم نرم بستر پر میرا کانٹا سا بے جان جسم پڑا ہوگا، چھدا ہوا، گہرے گہرے سوراخ ——— جن کے کناروں پر میرا سرخ سرخ خون جما ہوا سیاہ پڑ جائے گا ——— میرے ارمان حسرتیں بے سُری تانوں میں نغمۂ موت گنگنائیں گی۔ . . مگر ——— وہ مدھم سا شور ——— اس دنیا میں سیر کرنے والوں کو کبھی بھی سنائی نہ دے گا ——— اور مہکتے ہوئے پھول خوشی سے اسی طرح جھومتے رہیں گے ——— نرم نرم پتیوں میں کانٹوں کو چھپائے ——— میری روح بے چین پھرے گی ——— مگر میری ظلو ——— اف آج یہ ریکارڈ پر ریکارڈ اس اندھیری شام میں بجائے جا رہی ہے ——— افسردہ ہوائیں کانٹوں کا منہ چوم جاتی ہیں ——— مگر . . . وہ پھول کہاں ہے ——— نہ جانے کیا کیا سوچتے سوچتے میں کب سے رو رہی تھی ——— آنسو تھمتے ہی نہیں ——— کھانسی بھی اب نہیں اٹھ رہی ——— آج سے دو سال پہلے کے دن مجھے کھینچے لئے جا رہے تھے ——— جہاں پیاری میٹھی میٹھی سی یادیں مجھے اپنے آغوش میں بلا رہی تھیں ——— میٹھی میٹھی نیندوں میں ڈوبی ہوئی شربتی سی سنہری چمکیلی آنکھیں جن کے نرم نرم چمکیلے پردوں کے

چپے چپے تیز تیز نوکیلے کانٹوں کی سطح ـــــــ وہی میرا مہکتا ہوا پھول...
شریر سا خوبصورت حسین سا چہرہ خوبصورت جسم اور پیارے پیارے
خوبصورت، گلابی گلابی رخساروں جیسے ملائم ملائم ہاتھ ـــــــ پیاری
سے لمبے ناخن جیسے اب ذرا سی انگلی دبائی اور زردی کے بعد سرخ
سرخ خون جیسے انگلیوں اور ناخنوں سے بہہ ہی تو جائے گا ـــــــ
وہ شگفتہ ـــــــ کھلا کھلا سا چہرہ، گلابی گلابی ـــــــ قہقہوں
سے کھیلتے ہوئے لب ـــــــ کاش میرے قہقہے اس کے قہقہوں
سے نہ ٹکراتے ـــــــ اس کی وہ حاضر جوابی۔ یعنی میرا بہترین مشغلہ..
... جو اس نے مجھ سے چھین لیا ـــــــ یاد ہے ـــــــ
مجھے ـــــــ ابھی تک تین چار سال کی باتیں جیسے ابھی ایک گھنٹہ پہلے
مجھ پر بیت چکی ہوں ـــــــ گگی ہے ـــــــ صفدر کا بے حد دوست،
عجیب سا انسان ـــــــ ایسی ہی شام کو صفدر نے مسکراتے ہوئے
میرا تعارف بھی گگی سے کرایا تھا۔ یہ ہیں میرے عزیز ترین دوست
مسٹر گگی ـــــــ اور میں نے گگی کو دیکھا ـــــــ سفید شیروانی
خوبصورت جسم۔ سیاہ چمکدار بال گلابی گلابی سا چہرہ جو اور بھی سرخ ہو گیا تھا
ـــــــ سنہری چمکیلی شریر سی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں ـــــــ
کتنا ـــــــ معصوم سا چہرا تھا ابھرے ابھرے نقش ـــــــ اور

گلابی گلابی خوبصورت ہاتھ ——— اور لمبی لمبی انگلیوں میں ——— چمکتا ہوا نگ جیسے کانپ رہا ہو۔ آنے والے وقت کے خوف سے۔ میں جیسے اس مسکراتے ہوئے پھول کی مہک سے مدہوش ہوئی جا رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے پھول کی بھینی بھینی خوشبو مجھے کھینچ رہی ہے۔ . . . . میں بھی ہر وقت پھولوں کی کیاریوں کے خواب دیکھتی، مہکتے ہوئے پھول، جھومتے ہوئے۔ ایک دن ان پھولوں ہی سے ایک پھول میرے سامنے جھک گیا ——— اور میں بھی جھک گئی اُسے اٹھانے کو ———

اس رات کھانے کی میز پر . . . . گگی کی کانپتی ہوئی انگلیوں نے وہ کانپتے ہوئے نگ کی سفید انگوٹھی میری انگلی میں پہنا دی تھی ——— اور میرے جھکے ہوئے منہ کے نیچے شرارت سے لبریز سنہری آنکھیں پھراتے ہوئے کہا تھا ——— شفق ——— اس کا مطلب سمجھتی ہو ——— اور میں نے کہا تھا ——— نہیں ——— جانتے ہوئے بھی ایسے ہی۔

سرخ لب تھرائے۔ اور میرے ذہن پر میری زندگی پر ——— پانچ سال، جیسے نقش بن گئے تھے ——— پانچ سال بعد اس کی وجہ اس کا مطلب نہیں بتاؤں گا ——— میں کتنی خوش تھی ———

میراجی چاہا کر اٹھ کر خوب ناچوں خوب قہقہے لگاؤں، دنیا بھر کی خوشی مجھ میں آکر سماگئی تھی ——— اور ان سنہری آنکھوں میں جن کے ریشمی نرم سنہری پردوں کے پیچھے ننھے ننھے نوکیلے کانٹے تھے ٠ ٠ ٠ ٠ ٠ ——— ان میں ہی بسنت بہار تھی اور جیون کا رس سنگھار ———

میرے دل کی دھڑکنیں پانچ سال گننے لگیں ——— وہ معصوم سا گگی مجھ سے دور چلا گیا ——— شاید کسی اور دنیا کی سیر کرنے ——— مگر میرے ہوش و حواس میں مہکتے ہوئے پھول کی خوشبوئیں ہوتی تھیں۔ کانپتے ہوئے نگینے کے ساتھ میں اکثر چاندنی راتوں میں کانپتی ہوئی ندی کے کنارے کانپتے ہوئے چاند کو دیکھا کرتی تھی۔ رات رات بھر ——— یا پھر تاریک سے کمرے میں ایک ایک ریکارڈ کو چار چار مرتبہ بجا کر دن کاٹا کرتی تھی، گھنگھور گھٹاؤں کے سایوں میں گھنٹوں بیٹھے بیٹھے اونچے محل بنائے۔ جہاں خوشی ہی خوشی ناچتی پھرتی تھی۔ جہاں ہنستے ہوئے دن ناچتی ہوئی راتیں میں اپنے گگی کے ساتھ دو تین گھنٹوں میں گزار چکی تھی ——— مگر گگی کی گرجتی ہوئی باتیں جو میری زندگی میں سماگئی تھیں سب ——— اس روز کی ملاقات میں چھپ گئیں۔ جن کے سہارے میں اتنے دن جیا کی ——— اپنے

آپ نہیں تصورات کے سہارے ــــــــ

اب بھی وہ الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ اسی طرح سے جیسے میرے سامنے بیٹھے نیچے نظریں کئے ہوئے کہہ رہے ہوں۔ اندھیرے میں چمکتی ہوئی آنکھیں۔ ایک خاص قسم کی سفیدی چہرے پر چھلک رہی تھی ــــــــ میری شفیق ــــــــ

میں آج تم سے صاف صاف کہنا چاہتا ہوں . . . مجھے تم جان سے زیادہ عزیز ہو ــــــــ مگر ــــــــ مگر ــــــــ جب دو ہستیاں آپس میں محبت کرنے لگیں تو . . . . . . تو پھر وہ پاک جذبے میں دونوں بہنے لگتے ہیں ــــــــ اور میں یہی چاہتا ہوں ــــــــ ہم دونوں کے دل پاک ہوں اور جتنا دور رہیں، مگر تخیل میں اتنے ہی قریب۔ میری بے چینی تم اتنی دور سے محسوس کرو ــــــــ جتنی کے میں کروں ــــــــ اس وقت میں تمہارے کتنے قریب ہوں جانتی ہو۔ اگر کوئی دوسرا شخص ہو ــــــــ تو دیوانہ ہو جائے ــــــــ میں اب بہت دور چلا جاؤں گا ــــــــ بہت دور بہت ہی دور ــــــــ جہاں مجھے کوئی بھی نہ جانے اور نہ میں ہی کسی کو جان سکوں ــــــــ تم مجھ کو بھول جانا ــــــــ اور میں تم کو بھلانے کے لئے۔ ایسی چیز پیا کروں گا ــــــــ جس کو پی کر ــــــــ

تم اور بھی حسین نظر آیا کرو گی۔ میری بے چین زندگی کو کچھ دیر کے لئے سکون مل جایا کرے گا ——

میں جیسے سن سی ہو گئی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا۔ جیسے میری بہت ہی قیمتی چیز کسی نے چرالی ہے جسے میں آج تک تین سال سے چھپائے چھپائے چلی آرہی تھی۔ میں پاگل سی ہو گئی تھی۔ اور میں نے اس کے کانپتی ہوئی انگلیوں پر وہ کانپتی ہوئی انگوٹھی والا ہاتھ رکھ دیا تھا —— مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا وہ نجانے کیا کہہ رہا تھا —— ہاں اس نے یہ بھی کہا تھا —— پاک محبت شادی کے بعد نہیں رہتی۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے —— اور میں کانپ گئی تھی —— کیا کہا —— آپ کا ذاتی تجربہ —— میں سرد سی پڑ گئی تھی —— اس روز سے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے جسم میں کسی نے کانٹے ہی کانٹے چبھو دئے ہیں۔ پھولوں کی نرم نرم پتیاں اب مرجھا کر گر پڑی ہیں۔ اور ان نوکیلے نوکیلے کانٹوں نے میری زندگی کو چھلنی چھلنی کر دیا ہے۔ میرے قہقہے، میری مسکراہٹ، میرا وہ چلبلا پن، میرا چین، سب کچھ چھین کر ہر وقت جلنے والی آگ سی سارے جسم میں بھر دی —— اور اب اداس اداس شامیں، سوگوار صبحیں۔ اور سیاہ بھیانک سی راتیں۔

گرم آگ، میں جلتا جسم، اور مہکتے ہوئے پھولوں کا تحفہ ——— یہ نوکیلے تیز تیز سے کانٹے ——— جن کی نوکوں نے میرا خون چوس لیا ہے ——— وہ شریر شریر سی آنکھیں جن میں دنیا بھر کا چین تھا ——— اب بہت دور نہ جانے کہاں کھو گئیں ———
اب یہ کاغذ پر چمک رہی ہیں۔ یہی گگی کی تصویر ہے جس کے دیکھنے کے لئے اس تیز بخار میں اپنے کمرے سے یہاں اس ندھیرے ڈرائنگ روم میں آگئی ہوں ——— اس پھولوں کے گلدان کے نیچے پھولوں کے سائے تلے یہ میز پر رکھی ہے۔ وہی شریر سی مسکراتی ہوئی آنکھیں ——— وہی مسکراتے ہوئے لب، جیسے قہقہے سہم کر رہ گئے ہوں۔ وہی سیاہ سے بال جیسے میری اندھیری راتیں ان سے ٹکرا کر آتی ہوں ——— مگر ——— فرق اب اتنا ہے ——— کہ تمہاری شفق اب ——— رات کی سیاہی میں بدل جانے والی ہے اس پاک جذبے کے سہارے جیتے دنوں کے سہارے اب وہ اپنی منزل پر گھسٹتی گھسٹتی آ ہی پہنچے گی۔ دیر ہے تو اتنی یہ ٹی بی کے سورج کی تیسری اور آخری گھڑی بھی آ پہنچے۔ یہ غروب ہوا اور شفق پہ سیاہی پھیل جائے گی۔ کانٹوں کا زہر اپنا اثر تب دکھائے گا ———
اف اللہ پھر کھانسی شروع ہو گئی ——— خالہ جان نہ آجائیں

اور یہ صلوات ہو گئی اور اب تک ریکارڈ بجا رہی ہے۔

نین ہین کو راہ دکھاؤ ——— پربھو پگ پگ ٹھوکر کھاؤں نین ہین کو ——— صلو یہ ریکارڈ بجائے ہی جا رہی تھی۔

راہ دکھاؤ پربھو اور مجھے کھانسی اٹھنے لگی۔ جیسے میرا کام ختم ہونے والا ہے۔ میرے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

پگ پگ ٹھوکر کھاؤں پربھو نین ہین کو راہ دکھاؤ۔

ٹوٹا ہوا کھلونا

ساحرہ، ساحرہ ——— نجمی نے بھیا کے کمرے سے آواز دی —
نجمی آگئے ——— مجھے چوٹی گوندھنی بھی مصیبت ہو گئی ——— نجمی
میں نے خشک لبوں کو تر کرتے ہوئے ذرا نام کو غور سے دہرایا ———
نجمی ——— کتنا اچھا نام ہے ——— دوسرے کمرے سے امّی
کی آواز آرہی تھی۔ شاید نجمی سے کہہ رہی تھیں اُف خدا میں تو اس لڑکی سے
تنگ آگئی ہوں ——— ہر وقت وہ ہے کمرہ ہے چوبیس گھنٹے کھڑکی
کھلی ہوئی ٹانگیں پسارے پلنگ پر دراز ہیں۔ یا بہت ہوا تو کہنے سننے سے
سر گوندھ لیا۔ مہینوں ہو جاتے ہیں سر میں تیل تک نہیں ڈالا جاتا ———
ویسے تو ہر مہینے نئے نئے قسم کے تیل آجاتے ہیں۔ آج امّی یہ بہت ہی بڑھیا

قسم کا تیل لائی ہوں۔ ذرا سونگھئے تو، زمانے کی رفتار ہی عجب ہوتی جاتی ہے
خدا بری گھڑی سے بچائے۔ دنیا ڈالتی چلی آتی ہے۔ کبھی کھوپرے کا تیل
ڈال لیا یا وہ دھوئی تلی کا کچی گھانی کا تیل۔ ختم ہوئی بات۔ جمعہ کے جمعہ سر دھو لیا
پھر دیکھو بالوں کی حالت۔ اب تو کم بخت سنہری سے بلکجے ہو گئے موئے نہ
وہ سنہری رہے نہ کالے۔ کچھ عجیب ہی رنگ ہو گیا ہے بالوں کا میں تو
تنگ آ گئی۔ لڑکی جوں جوں سیانی ہوتی جاتی ہے۔ نخرے بڑھتے ہی جاتے
ہیں۔ سہیلیاں دیکھو تو الٰہی توبہ اسے نجمی اللہ قسم کل ایک صاحبزادی آئیں
بال ایسے تھے جیسے چڑیوں کا گھونسلا۔ بال نہ سیاہ تھے نہ سنہری۔ کچھ عجیب
ہی سے تھے تیل کی شکل تو سالوں نہ دیکھی تھی۔ بکھرے بکھرے سے میرا تو دیکھتے
دیکھتے سر چکرانے لگا۔ کندھوں پہ کھلے ہوئے پڑے تھے۔ کپڑے تو ایسے اچھے
قیمتی پہنے تھے۔ مگر بال باندھنے کو ایک چیتھڑا بھی نصیب نہ ہوا میری جان
ہی تو جل گئی۔ اور ہنسی بھی آ گئی کہ اتنی کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ کچھ کہتے ہوئے
بھی تو برا معلوم ہوتا، ماں ٹھہری جو لی جیسی غضب کی لڑکی جس کے لئے
لڑکے کنا ... پلیس پہ بیسیوں چکر لگا جاتے ہوں گے کہ شاید مل جائے یا
نظر آ جائے۔ کاش ہم ایک دفعہ بات کر سکتے ——— اور اس غریب
کی یہ درگت بن رہی ہے وہ تو خدا کی ہی کچھ مہربانی ہے جو جولی صاحبہ مجھ
پہ مہربان ہیں ورنہ اور بھی اس کی کلاس فیلو ہیں مگر کبھی جو ڈھنگ سے بات

کی ہو کسی سے ـــــــ

میں نے آخری مرتبہ سر پر کنگھی پھیری۔ قدِ آدم آئینہ میں آج نہ جانے مجھے اپنی شکل کچھ بہتر محسوس ہو رہی تھی۔ گول چہرہ کو دیکھتے دیکھتے میں اُکتا گئی تھی۔ ہاں البتہ آنکھیں مجھے ہمیشہ اپنی پسند ہیں۔ کیونکہ غور سے دیکھتے دیکھتے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ میری نہیں۔ اور شاید مجھی کی یا ان ہی جیسے کسی اور بھائی کی آنکھیں ہوں۔ جو آئینہ میں ملتے ہی۔ منہ سرخ ہو جاتا ہے اور ایک پھریری کے ساتھ۔ سارے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے لمبی لمبی انگلیاں خود بخود بند ہو جاتی اور بغیر اجازت کے آنکھیں نیچے جھک جاتیں جیسے کسی کو جھک کر آداب کر رہی ہوں۔ میرے ہاتھ آج حد سے زیادہ سفید نظر آ رہے تھے شاید کالی ساڑھی کی وجہ سے، ساڑھی کا پلو ٹھیک کرتے ہوئے، میرے ہاتھ اب کمر پر تھے۔ سفید ساٹن کا بلاؤز۔ کمر پر کس قدر فٹ ہے۔ اور جارجٹ کی نرم نرم ساڑھی باریک نرم نرم سی، میری محبوب ساڑھی۔ مگر میرا رنگ زرد کیوں ہے۔ ظاہراً میں سب کو خوش نظر آتی ہوں۔ امّی کو یہی فکر دامنگیر ہے کہ تم ہر وقت لیٹی رہتی ہو۔ ہر وقت پڑھتی رہتی ہو ـــــــ ایک کمرے میں گھسے رہنا۔ آخر صحت کیسے قایم رہ سکتی ہے ـــــــ مجھے ان کی باتوں پر باوجود ضبط کے ہنسی آ جاتی ہے۔ مگر اس کے جواب میں ان کی بڑی بڑی حیران نظریں جن سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ کہہ رہی ہوں

کہ لڑکی تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ——— میرا رنگ واقعی زرد ہوتا جا رہا ہے۔ ساڑھی کی پلیٹیں درست کرتے ہوئے میں نے سوچا ——— مگر کیوں میں نے شانوں کے پاس گرم گرم سانس سا محسوس کیا۔ شاید میرا خیال تھا اور میں جھکی ہوئی پلیٹیں درست کر رہی تھی۔ برقی پنکھے کی رفتار شاید خود بخود ہی تیز ہو گئی تھی ——— اور یہ چھوٹے چھوٹے خمدار بال انہیں نہ جانے اس قدر شوخی کیوں سوجھی تھی۔ میں نے بال درست کرنے کی نیت سے آئینہ میں دیکھا اور ذرا ہٹتے ہوئے اپنے پورے جسم کا جائزہ لینا چاہا۔ جو مجھے کسی کا چہرہ مل گیا ——— آئینہ میں اب دو چہرہ نظر آ رہے تھے چار آنکھیں۔ اور دو جسم ——— بالکل قریب۔ نجانے میرے زرد چہرہ پر اس قدر سرخی کہاں سے آ گئی تھی ——— پیشانی پر ننھے ننھے پسینہ کے قطرے نہ جانے کہاں سے آ گئے تھے۔ میں نے دور ہٹتے ہوئے۔ ایسے غصے سے جس میں خاک بھی غصہ نہ تھا۔ ارے آپ ——— اور میرے ہونٹ آپس میں جڑ گئے۔ ساڑھی کا پلو ٹھیک کرتے ہوئے میں نیچے نظریں کئے ہوئے۔ اپنے دل کی دھڑکن کا اندازہ لگا رہی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے چمکتے ہوئے پالش ——— پر میرا سگھڑاپا نظر آ رہا تھا۔ پاؤڈر لگانا بھی نہیں آتا۔ دیکھئے تو کتنا پاؤڈر گرایا ہے؟ ——— کتنے بیہودہ سے انسان ہیں ایک تو بلا اجازت میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ اور اوپر سے نصیحت۔ نجمی کے آنے سے پہلے میں کتنی بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ میرے دل میں کتنی قدر تھی، ذرا

کبھی تو خوددار نہیں۔ یہ شخص خودداری ——— خودداری، میری آنکھیں جلنے لگیں۔ کرسی کے گول گول سوراخوں میں ایسا معلوم ہوا جیسے یہ لفظ گول گول گھوم رہے ہیں، مجھے بے اختیار ——— روشندی یاد آگئے کتنے خوددار ہیں کیا مجال جو فضول بات منہ سے نکالیں ——— سُرخ سفید چہرہ مغرور ابرو تیکھے تیکھے نقش۔ سفید سلک کی قمیص عنابی ٹائی اور ——— اور ——— نیلی چمکدار سی آنکھیں، گلابی گیلے گیلے کانپتے ہوئے لب ——— روشندی ——— فلاسفر ——— چہرہ پر ایک طنزیہ مسکراہٹ جولی کی سالگرہ میں شائد ملاقات ہوئی تھی جبھی تو اس کی طرف متوجہ تھیں مگر وہ ہر ایک کا جواب ایک طنز آمیز مسکراہٹ پر ختم کرتا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔ اونھ اس قدر غرّا۔ اس قدر میک اپ جیسے اپنی ساری زندگی پر میک اپ کر لیا ہو۔ ہر آرزو پہ دولت کا روغن کر لیا ہو۔ دماغی احساس مردہ کر کے ظاہرا چلبلا پن سیکھ لیا ہو۔ آنسوؤں کو چھلکنے کے خوف سے آنکھوں کی گہرائیوں میں ہی سلا دیا ہو۔ شاید ان کی چمک ہی کسی کو لا بٹھائے، ابن آدم اتنے معصوم نہیں ایکٹنگ ہم سے سیکھو۔ ہم پیدائشی ایکٹر ہیں اور اچھے ایکٹر کی تعریف یہی ہے کہ اپنی جان تک خطرہ میں ڈالنے کو تیار رہو۔ تم کہو گی یہ غلط ہے۔ آدم بہت ہی سادہ لوح تھے۔ ہر مرد عورت کے سامنے جھک جاتا ہے۔ یہ اس کی فطری کمزوری ہے۔ مگر جانتی ہو۔ یہ سب غلط ہے

کامیاب ایکٹر مر جاتا ۔ ۔ ۔ ۔ پسند کرے گا مگر یہ نہیں سننا پسند کرے گا۔ کہ لوگ اس کو یہ کہیں کہ ڈرامہ کا پلاٹ اچھا تھا۔ مگر یہ ایکٹنگ نہ کر سکا ــــــ کبھی نہیں، وہ ہر قربانی دینے کو تیار ہے تم کہو گی اونہہ اور آدم حوا کو کتنا چاہتے تھے۔ کہ انہوں نے حوا کی خواہش پہ اپنا عیش و آرام تک چھوڑ دیا۔ کیا یہ غلط ہے۔ نہیں بالکل نہیں مگر آدم ایسے نہ تھے۔ وہ حوا کو احساس دلا چکے تھے میں تم سے محبت کرتا ہوں تمہیں بے انتہا چاہتا ہوں۔ تمہارے بغیر میری دنیا تاریک ہو جائے گی میں تمہارے ایک اشارے پہ اپنی ہر خواہش کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر سکتا ہوں۔ میری زندگی تم سے ہے۔ میری بہار تم ہو۔ میری خواہشات کا نچوڑ تم ہو۔ میری اندھیری راتوں کا چاند تمہارا حسین چہرہ ہے۔ میری نیندیں تمہاری سیاہ زلفوں میں پوشیدہ ہیں۔ ہر سانس کی گرمی تمہارے تھرتھراتے ہوئے لب ہیں ــــــ پھر جانتی ہو حوا کا وہ ــــــ پہلا حربہ تھا۔ اور آدم کا وہ پہلا امتحان ــــــ اور آدم کو کہنا ماننا پڑا آنکی ایکٹنگ اتنی کامیاب ہوئی ہم نے ڈرامے کا پہلا سین نہیں دیکھا۔ مگر لوگوں کی زبان سے سنا ہے کتابوں میں پڑھا ہے۔ کتنی شاندار ایکٹنگ تھی اور کتنا کامیاب اثر ہوا۔ جانتی ہو عورت کا دل اُس وقت ٹوٹ جاتا ہے جیسے کوئی بچہ کھیلتے کھیلتے اکتا جائے۔ ہر وقت وہی کھلونا اس کی

نظروں کے سامنے رہے آخر غور سے دیکھتے دیکھتے اس کے چہرہ سے نقاب
اٹھ جاتی ہے اور اس کی خوبیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ نظریں جم جاتی ہیں۔ اور
کھلونے ہی کا مرکز بن جاتی ہیں۔ رفتہ رفتہ کھلونے میں حرکت شروع ہو جاتی
ہے۔ اور وہ کسی دل کا بہلاوا بن جاتا ہے اسی طرح دن بیت جاتا ہے
اور بچہ کھیلتے کھیلتے کھلونے کو لے کر سو جاتا ہے۔ اور ایسا مدہوش ہو جاتا ہے کہ
خواب میں بھی وہ کھلونے کے ساتھ ساتھ پھرتا رہتا ہے صبح ہوتے ہی
دنیا میں کھلونوں کی دوکانیں سجائی جاتی ہیں۔ بچہ ہمک ہمک کر نیا کھلونا
مانگتا ہے پرانے کھلونے کی جگہ اب نئے کھلونے لے لیتا ہے اور پرانا
کھلونا۔ منہ چڑا کے پھینک دیا جاتا ہے . . . . اب نئے کھلونے
کی رنگینی پر اس کی نظریں جم جاتی ہیں۔ آندھی آتی ہے۔ اندھیری رات میں
طوفان آتا ہے۔ بارش ہوتی ہے ٹوٹے ہوئے کھلونے کا روغن بارش کے
پانی سے بہہ جاتا ہے اور مٹی نکل آتی ہے۔ وہ رنگ و روپ نہ جانے
کہاں غائب ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ لوگوں کی آمد و رفت سے کھلونے کا چورا
چورا ہو جاتا ہے پہلے سے رنگ کی مٹی نظر آنے لگتی ہے۔ باریک مٹی ہوا میں
مل جاتی ہے۔ اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جھاڑو کی مدد سے کوڑے کے
ڈھیر میں اور نیا کھلونا سفید سفید نرم نرم پلنگ پر اپنے ہی جیسے ننھے سے
ساتھی کی ننھی ننھی باہوں کی گرفت میں۔ یہانتک کہ کھڑکی سے سورج کی

کرنیں اندر داخل ہو جاتی ہیں اور ننھے سے چہرہ پر ایک والہانہ مسکراہٹ رقص کرتی نظر آتی۔ بالکل ایسی جیسی رشدی کے چہرہ پر صبر جواب کے بعد مسکراہٹ دوڑ جائے۔ مجھے سخت گرمی لگ رہی تھی۔ پسینے پسینے ہو رہی تھی۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا کار کا ہورن زور سے بجا میری آنکھ کھل گئی۔ باہر ہورن زور زور سے بج رہا تھا ——— میں نے اپنے اوپر نظر ڈالی۔ کالی ساڑھی اب جسم سے لپٹ گئی تھی۔ ساٹن کا بلاوز پسینے سے بھیگ گیا تھا۔ آنکھیں جلنے لگیں ——— ہاتھ پاؤں ایسے ہو گئے تھے جیسے ان میں جان ہی نہ ہو۔ مجھے یاد آیا اوہ مجھے تو چھ بجے نجمی کی سالگرہ کی پارٹی میں جانا تھا جس کے لئے تیار ہو کر کار کا انتظار کرنے کے لئے کمرے میں پلنگ پہ یونہی سا لیٹ گئی تھی۔ گھڑی میں پورے چھ بجے تھے، میرا دل گھبرا رہا تھا۔ کار کا ہورن بجا اور دوسرے کمرے سے امی کی آواز آئی۔

ساحرہ، ساحرہ، نجمی کی کار آگئی ہے جانا ہے یا نہیں تو یہ بھئی اس لڑکی سے تو میں بیزار ہو گئی ہوں۔ گھنٹوں سے کار کھڑی ہے۔ مگر بیگم صاحب تیار ہی نہیں۔ تمہاری خالہ جان کے ہاں سے دو دفعہ نوکر بھی آیا اور ایک دفعہ نجمی بھی آیا تھا۔ تمہارے کمرے میں گیا اور پھر واپس چلا گیا ———

بھئی عجیب لڑکی ہو تم بھی آخر یہ بھی بچکو۔ خدا نے خیریت سے ایک سال اور گذار دیا۔ اللہ آسے خوش رکھے، اللہ اسے زندہ سلامت رکھے کیا اچھا

بچے سہے۔ اور اسی اپنی ملاقاتی خاتون سے باتیں کرنے لگیں۔ اونھ یہ ہم سے بیزار ہیں۔ میں خود دنیا سے بیزار ہوں، میں نہیں جاؤں گی ـــــــ کبھی نہیں جاؤں گی۔ خیریت سے ایک سال اور بیت گیا۔ اونھ میری زندگی ایک سال فریب میں گذری۔ تین سال اور ابھی کھیلنے میں گذریں گے۔ اور پھر پہلا کھلونا توڑ دیا جائے گا ـــــــ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ زرد زرد انگلیوں میں جلن سی ہونے لگی ہیرے کی انگوٹھی انگلی کو بھینچ رہی تھی میری روح کانپ گئی ـــــــ میں نے آئینہ میں شکل دیکھی سونے سے پہلے کالی ساڑھی کے آنچل میں زرد چہرہ سفیدی میں تبدیل ہو گیا تھا۔ زردی غائب تھی اور رخسار گلابی۔ خشک ہونٹ گیلے اور سرخ تھے۔ مگر ـــــ مگر ـــــ اب آنکھ کھلنے پر وہی زرد چہرہ تھا۔ ہونٹ خشک تھے۔ پسینہ پونچھنے سے سفید رومال کو دیکھا تو اس کی سفیدی کچھ سیاہی اور سرخی میں تبدیل ہو گئی تھی اور میری شکل بالکل ایسی ہو گئی تھی ـــــــ جیسے ٹوٹے ہوئے کھلونے کی بارش کے بعد ـــــــ میری آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں ـــــــ اور ایسا معلوم ہوا جیسے نجمی کے پیروں پہ میری انگلی کی انگوٹھی خود بخود نکل کر گر پڑی ہے۔ نجمی کے لب کانپ رہے تھے۔ جیسے کہہ رہا ہو میری بہار تم ہو، تمہارے بغیر میری دنیا تاریک ہو جائے گی۔ میری نیندیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہاری ان زلفوں میں روپوش ہو جائے گی ـــــــ میں چیخ اٹھی ابّا آدم

یہ تمہارا ہی حصہ ہے کاش میں بھی ایسی کامیاب ایکٹنگ کر سکتی ——— اس
ڈراما کا اینڈ یہی ہونا چاہئے تھا ———
پردہ گر جائے، بس نجمی بس ——— میرا سانس گھٹ رہا تھا ———
میرے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اور زور سے ہوا چلنے لگی ———
آندھی آئی بادل گرجے اور زور شور سے بارش شروع ہو گئی ———

میری روح کانپ رہی تھی۔ میرے ہاتھ پیر ٹھنڈے سے ہو گئے جیسے مجھے کسی نے اوپر سے پھینک دیا ہو۔ سانس آہستہ آہستہ چل رہا تھا ——— کسی کے قہقہوں سے میری آنکھ کھل گئی۔ نجمی اور روحہ مجھے لینے آئے تھے مجھے دونوں کی شکلوں سے نفرت سی ہو گئی۔ روحہ نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ ساحرہ تمہیں کیا ہوا۔ سب انتظار کر رہے ہیں ——— اُف اللہ تمہارا رنگ کیوں زرد ہو رہا ہے۔ اور پسینہ، پنکھا بھی چل رہا ہے، آخر کیوں؟ ——— روحہ آج اتنی خوش کیوں ہے۔ میں نے اس کے چمکتے ہوئے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا۔ اور یہ زرق برق عنابی ساڑھی۔ میں نے اچٹتی ہوئی نظر آئینہ پر ڈالی دو شاداب چمکتے ہوئے سرخ و سفید چہروں کے بیچ میں، کالے آنچل میں کمہلایا ہوا زرد چہرہ ——— آنسوؤں سے لبریز آنکھیں ———
حرف شیشے سے ٹکرا کر رہ گئیں، اور پر جوش نظریں آپس میں سما گئیں ———

میرے زرد ہاتھوں کو دباتے ہوئے روحی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ساحرہ نجمی بھیا نے اپنی سالگرہ میں تمہیں کیا دیا۔ وہ مسکرا رہی تھی اس کی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔ نجمی نے گھبراتے ہوئے جواب دیا ابھی ——— ابھی انہیں کچھ بھی نہیں دیا کیونکہ انہیں شاید اتنی خوشی تھی اس ڈائمنڈ اور ان کی یہ ہیرا اور یہ کالی ساڑھی ——— ہاں اگر یہ دیر کی معافی مانگیں اور ساڑھی چینج کر لیں تو ہم پھر انہیں ایک ایسی چیز دیں گے جو انہیں کبھی نہیں ملے گی۔

میں نے روحی کی طرف دیکھا۔ اس کے سرخ چہرہ میں کچھ کچھ زردی جھلک رہی تھی۔ مگر میری طرف دیکھتے ہی مسکرانے لگی۔ ساحرہ مجھے نجمی بھائی نے ایک چیز دی ہے یہ کہہ کر اس نے اپنے سفید ہاتھ میرے زرد ہاتھوں پہ رکھ دیئے۔ اس کی لمبی لمبی انگلیوں میں سرخ رنگ کی نئی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ فرق صرف یہ تھا میرے زرد ہاتھوں کی انگلی میں انگلی کو کھینچ دینے والی سفید ہیرے کی انگوٹھی تھی جس کا نگ کانپ رہا تھا ——— میری پیشانی پہ ایسا معلوم ہوا جیسے ٹھنڈے پانی کو فواروں کی صورت میں کوئی بہا رہا ہے ——— میں نے بوجھل نگاہیں نجمی کے چہرے پہ گاڑ دیں ——— وہ بے حد گھبرایا ہوا سا تھا۔ پیشانی پسینے سے تربتر تھی۔ اور اسی کے یہ الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے خدا عمر دے کتنا اچھا ہے ——— روحی کی اس آواز نے چونکا دیا۔ نجمی تم ساحرہ کو کیا دو گے اگر یہ ساڑھی چینج کر لیں اس کی مسکراہٹ میں جلن کی ڈ

نے رہی تھی میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ــــــ میں بتاؤں

ـــــــ ہاں ہاں نجمی نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا میں نے روحہ کی خوفزدہ

نظروں کو سہماتے ہوئے کہا۔ ٹوٹا ہوا کھلونا میرا جی چاہا خوب ہنسوں زور زور

سے قہقہہ ماروں کہ دونوں کے کان پھٹنے لگیں۔ مگر میری انگلیاں اب ہیرے

کی انگوٹھی اتار کر زبردستی روحہ کی انگلیوں میں پہنا رہی تھی۔ اور میں نے بمشکل

کھڑے ہو کر جھکتے ہوئے روحہ کی گرم پیشانی پر اپنے خشک ہونٹ چھواتے

ہوئے کہا۔ چلو روحہ پیاری مجھے یہ کالی ساڑھی بے حد پسند ہے۔ اٹھو روحہ

کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ دونوں

انگلیوں میں ایک ساتھ دو نگ چمک رہے تھے سفید و سرخ جیسے شروع

شروع میں ان دونوں کے چہرے میں نے بے تاب ہو کر اپنی زرد انگلیوں

میں کالی ساڑھی کا آنچل لپٹنا شروع کر دیا۔ چلو، میں تیار ہوں میں نے کانپتے

ہوئے کہا مگر ایسا معلوم ہوا جیسے دونوں اپنی جگہ پر جم گئے ہوں۔ میری نگاہوں

کے سامنے ایک کالا سا پردہ پڑ گیا۔ دل جیسے اب پانی میں ڈوبنے ہی والا تھا۔

کچھ دیر سکون رہا اندھیرے میں میرا دل گھبرانے لگا، جیسے بارش ہونے

لگی میں نے دیکھا۔ بارش کے پانی سے ٹوٹے ہوئے کھلونے کا رنگ و روغن

سب غائب ہو چکا تھا۔ مگر گیلی گیلی پیلی پیلی ٹوٹے ہوئے کھلونے کی مٹی پانی میں

بہہ بہہ کر چاروں طرف عجیب عجیب شکل بنا رہی تھی ــــــ روحہ کا مسکرانا

ہوا چہرہ نجمی کا خوفزدہ چہرہ اور روشدی کی طنزیہ مسکراہٹ نجمی کے ساتھ ساتھ کہہ رہا تھا۔ ردحہ تم تو مجھے چھوڑ نہ جانا۔ میں تباہ ہو جاؤں گا۔ میری زندگی اب تم ہو صرف تم۔ میری بہار مجھے چھوڑ کر نہ جانا۔ میرے کانوں میں روشدی کے الفاظ گونج رہے تھے۔ جیسے وہ مسکرا کر کہہ رہا ہو او نہہ تم جانو دختر حوا ابن آدم اتنا بیوقوف ہے۔ یہ بہترین ایکٹر اپنی ایکٹنگ میں بڑی بڑی قربانیاں کر سکتا ہے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے بارش ہونے لگی میرے منہ پر بوندیں پڑنے لگیں گھبرا کر آنکھ کھولی۔ حیران تھی چاروں طرف گھر کے آدمی نظر آنے لگے، سب کے رنگ فق تھے ——— امی کی آنکھیں شاید رو رو کر سوجھ گئیں تھیں۔ اور ڈاکٹر نے آہستہ سے نجمی کو انگریزی میں کہا کہ مریضہ کے دل پر بہت بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ اب ذرا احتیاط کیجئے گا۔

اف اللہ میرا سانس گھٹنے لگا اور میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔ میں نے ہلکے سے بے اختیار چیختے ہوئے کہا ابن آدم ——— ٹوٹا ہوا کھلونا۔ اور امی کے الفاظ دور سے سنائی دے رہے تھے خدایا میری بچی کو بچا آج اس نے کالی ساڑھی پہنی ہے۔ ہر وقت اپنے کمرے میں اکیلی پڑی رہتی ہے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ کنوارا پنڈا ہے اچھی بری روحوں کا گذر ہوتا ہی رہتا ہے۔

کسی چیز کے گرنے سے میری آنکھ کھل گئی میں چونک پڑی نجمی اور ردحہ

جا چکے تھے۔ کیونکہ دیر ہو رہی تھی۔ پرویز زور زور سے رو رہا تھا۔ جسے آپا جان
بڑی مشکل سے خاموش کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ نہیں نہیں کھلونا میرا
کھلونا ——— وہ زور زور سے چیخ رہا تھا ———

میرے سر میں درد ہونے لگا۔ آپا جان کیوں رو رہا ہے بھئی کیا کروں یہ
بھی مصیبت ہے۔ کھلونا ٹوٹ گیا۔ کل بازار سے اور لا دوں گی پرویز چپکے
ہو جاؤ ——— خالہ جان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اور پرویز میری طرف
حیرت سے دیکھ رہا تھا ——— اور انگلی ٹوٹے ہوئے کھلونے کی طرف
تھی ———

دوآنے

راموا لے یہ پیسے ــــــ کمل نے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے
کہا ــــــ راموا بابو جی . . . . . کیسے پیسے . . . . میں لے لوں . . .
رامو . . . . نے ڈرتے ڈرتے . . . . . پھر پوچھا . . . . . . بابو جی یہہ
میں لے لوں . . . . . پیسے . . . . . . ہاں ہاں کمل نے تنگ آکر تیز لہجے
میں کہا . . . جس میں کچھ نرمی کی جھلک بھی تھی . . . . .

راموکا چھوٹا سا منہ کھل گیا۔ اس کے سیاہ چہرہ پہ سرخی چھاگئی . . .
آدھی پیشانی سے ڈھکی ہوئی موٹی آنکھیں جن میں آنسوؤں نے مستقل حلقہ
سا بنا رکھا تھا۔ جن میں کبھی فاقہ مستی کی جھلک پائی جاتی تھی! آج . . .
آج . . . . پہلی بار ان میں چمک پیدا ہوئی . . . . . اس نے . . . .

اپنے کھلے ہوئے گریبان کے آدھے ٹوٹے ہوئے بٹن کو مروڑتے ہوئے ... پوچھا- بابو جی یہ کتنے پیسے ہیں .... دو آنے بیوقوف لڑکے .... دو آنے ..... کمل نے نیم غصہ میں کہا-

رامو نے ...... دو میلی انگلیاں کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے اٹھاتے ہوئے .... کمل کے پیر چھوئے ...... اور اپنی میلی پھٹی ہوئی .... دھوتی کی انٹی میں باندھ لیں .... آج پہلی بار اس کو اتنی مسرت حاصل ہوئی تھی .... آج وہ اپنے گاؤں کے زمیندار کے لڑکے راجو سے مقابلہ کر سکتا تھا ...... وہ نہ جانے کیا کیا منصوبے باندھ رہا تھا- .... کہ دفعتہ ...... وہ زور سے ہل گیا ..... گویا اس پر بجلی گر پڑی ہو ..... وہ تھی کمل بابو کی ماتا کی آواز ..... کیوں رے ..... رامو- یہ پیسے کیسے ہیں ...... رامو ...... اپنے میلے زرد دانتوں کو اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے صاف کرنے لگا .... کچھ نہیں ماں .... کمل نے ذرا تیز لہجے میں کہا .... سریش کی ماں نے دیئے تھے ..... کیوں ..... رنجھا نے حیرت سے پوچھا ...... ماں وہ بیمار ہیں .... ڈاکٹر نے ان کا بلغم مانگا تھا- ٹسٹ کرنے کو ...... وہ بلغم ایک شیشی میں تھا ..... اس کو اٹھانا تھا ..... اور ڈاکٹر کے پاس لے جانا تھا ... میں اس لڑکے کو لے گیا تھا- واپس آتے وقت سریش کی ماں نے .....

دو آنے دیئے تھے۔

ماں ۔ ۔ ۔ ۔ اور ماں ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھ میں کیا چیز لایا ۔ ۔ ۔ مگر دکھاؤں گا نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ماں ۔ ۔ ۔ ۔ آج میں بھی راجو کی طرح سے ہو گیا ناماں ۔ ۔ ۔

رانی نے ۔ ۔ ۔ لمبی آہ کھینچ کر کہا ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں بیٹا ۔ ۔ ۔ ۔ تو راجو ۔ ۔ ۔ ۔ ہو گیا ۔ ۔ ۔ پرماتما کرے تجھے راجو جیسا مگر ہمارے ایسے بھاگ کہاں ۔ ۔ ۔ مگر میں تو تجھ کو راجو ہی سمجھتی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ تو میرا راجو ہے ۔ ۔ ۔ ۔ آخر لایا کیا ہے بیٹا ۔ ۔ ۔ ۔ رانی کی آنکھوں کے سامنے ایک دم دو انگلیاں ناچنے لگیں ۔ ۔ ۔ ۔ ماں دو آنے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دو آنے ۔ رانی کے کھردرے پاؤں پر دو میلی اکنیاں پڑی تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رانی ۔ ۔ ۔ کہاں سے لایا بیٹا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رانی نے خوفزدہ ہو کر پوچھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ماں بابو جی نے دیئے ہیں۔

خوشی سے ناچتے ہوئے راموں نے دوڑ کر ماں کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

ایک دل جو حوادثات اور مسلسل غم و یاس کے ہاتھوں سے چور ہو چکا تھا۔ جس کی ساری امنگیں پامال ہو چکی تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ اب حدِ نظر پر آندھیوں کی پناہ میں امید کا صرف ایک دیا ٹمٹما رہا تھا اس کی کشتیٔ حیات ساحل سے لگنے والی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ اس ٹوٹے ہوئے دل کی مدہم آواز ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دوسرا ننھا دھڑکتا ہوا دل ۔ ۔ ۔ ۔ دنیا کے نشیب و فراز سے بے خبر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دونوں دھڑکتے ہوئے دلوں کی آوازیں ۔ ۔ ۔ ۔ تیز ہوتی چلی گئیں ۔ ۔ ۔

راموآج مجھے سخت بخار ہے کیا تو پانی بھر لائے گا۔ . . . ہاں ہاں
. . . . . راموں نے اپنی بوسیدہ جیب میں دو آنے ڈالے اور میلی سی صراحی
سر پر رکھ کے سامنے والے کنوئیں پر جا پہنچا۔ چھوٹی سی بالٹی سے وہ پانی
کھینچنے لگا۔ بار بار جھک کر وہ بالٹی کو دیکھ لیتا تھا۔ آخری دفعہ بالٹی نکالنے
کو وہ جونہی جھکا ایک ہلکی سی آواز ہوئی اور ساتھ ہی پانی کی سطح پر دو بلبلے اٹھے
. . . . . . اور غائب . . . . . یہ دنیا کے حسن کی معمولی سی جھلک تھی جو غائب
ہو چکی تھی۔ اور دو اکنیاں کنوئیں کی تہہ میں پڑی ہوئی راموں پر مسکرا رہی تھیں۔

نیلی فراک

بی بی جی! آپ کو نوکر کی ضرورت ہے۔ گرم کمرے ہیں اس کے برف جیسے
ٹھنڈے پاؤں ——— کچھ دیر کے لئے ایسے ہو گئے جیسے ان میں جان ہی نہیں ——
وہ بغیر اجازت نرم نرم قالین پہ بے نکان بیٹھ گئی ——— گویا وہ اس کا گھر تھا ——
میز کے چاروں طرف . . . . سُرخ و سفید چہرے۔ شاید اس ہی کی طرف متوجہ تھے
——— وہ کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔ بغیر پوچھے گچھے۔ نوکروں سے جان بچاتی ہوئی، پالتو
کتوں کی نظروں سے بچتی ہوئی۔ نہ جانے کس مشکل سے یہاں تک پہنچی —— اور اب
زبان کام نہیں کرتی۔ بے قرار دل دھڑکنے کے سوا شاید کچھ جانتا ہی نہیں ہاتھ بغیر ضرورت
کے کانپ رہے ہیں۔ حلق نہ جانے کیوں اس قدر خشک ہو گیا ہے۔ گردن جھکی جا رہی
ہے ——— دوپٹے کو بھی آج ضد ہو گئی ہے ——— گھڑی گھڑی سر سے اتر

جاتا ہے اور انگلیوں میں طاقت نہیں —— پاؤں سن ہو گئے ہیں —— بدن سرد ہو گیا ہے۔ مگر رخسار اور کانوں کی لویں۔ اور آنکھیں اس قدر جل رہی ہیں۔ جیسے سارے بدن کی گرمی ان میں سمٹ کے آگئی ہو —— اگر نگاہیں اٹھتی بھی ہیں۔ تو —— نہ جانے کیوں دوسری نگاہوں سے ٹکرا کر زمین میں گڑ جاتی ہیں —— بوسیدہ دوپٹہ کا پلو انگلیوں میں لپٹتے لپٹتے۔ اب عنقریب چر سے پھٹ جائے گا۔ اور شاید پھر مجھے اپنی بے بسی پر اپنی اس گھبراہٹ پر۔ اپنی اُن اُبھری ہوئی کلائیوں کی بوٹیاں۔ نوچنے کو جی چاہے گا —— مگر اپنی بے بسی کا احساس کرتے ہوئے سوائے رونے کے اور کچھ نہ کر سکوں گی —— ہائے عورت کتنی مجبور ہے —— بہت سے آدمیوں سے سنا تھا۔ نواب صاحب بڑے شریف اور کنبہ پرور آدمی ہیں۔ ہر غریب کی مدد۔ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ خاص طور پہ غریب عورتوں کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ خیر سے چار لڑکے ہیں۔ چاروں کے چاروں اللہ میاں کی گائیں ہیں۔ شرم میں تو لڑکیوں کو مات کرتے ہیں۔ کھانے کے وقت زنان خانے میں آئے۔ باقی وقت نظر تو آجائیں —— خوبصورت ایسے کہ سارے شہر میں چراغ لے کے ڈھونڈو تو بھی نصیب نہ ہوں —— عالم خاں اور نہ جانے کیا کیا —— وہ مکان دار کی لڑکی رضیہ کہہ رہی تھی —— اونھ میں تو کبھی بھی ایسی باتیں نہ سنتی۔ مگر وقت سب کچھ کراتا ہے۔ اور پھر پڑھی نہ لکھی —— اب دنیا میں کون تھا اس کا —— اندھا کیا چاہے۔ دو آنکھیں۔ ایسے شریف نواب

کی دو حور سی لڑکیاں بھی تھی۔ چھوٹی لڑکی ذرا لاڈلی ہے اس لئے اس کی ہم عمر ایک لڑکی کی ضرورت تھی۔ جو صرف ان کا دل بہلائے ــــــ مگر ــــ کیا اس کے پاس ایسا دل نہ تھا۔ کاش اس کا باپ بھی نواب ہوتا ــــــ مگر شریف تو تھا۔ مگر اب تو اتنی لمبی چوڑی دنیا کے اوپر اتنے لمبے چوڑے آسمان کے نیچے کوئی بھی تو اس کا نہ تھا ــــــ اور پھر پہاڑ سی زندگی کاٹنی وہ بھی ایک لڑکی کو جو وقت کے ساتھ عورت بھی بننے سے شائد انکار نہ کرے۔ کتنے عیش کی زندگی تھی اس کی جب وہ چھوٹی سی ناسمجھ لڑکی تھی۔ اس کا جی چاہتا وہ پڑوس کی دادی سے اپنے بچپن کے زمانے کی باتیں ہمیشہ ہمیشہ سنتی رہے جو کبھی ختم نہ ہوں۔ بوسیدہ پھٹی ہوئی گدڑی لپیٹے ہوئے بوڑھی دادی۔ جاڑوں کی اندھیری رات۔ اندھیری سی کوٹھری۔ پھٹی ہوئی دری کا بستر۔ ہر ہوا کے جھونکے سے۔ وہ ٹمٹماتا ہوا دیا۔ ایک سِسکی سی بھرتا تھا۔ مگر فوراً ہی دادی کے سفید بال چمکنے لگتے تھے اور پھر دادی کی گدلی سی آنکھیں کتنے غور سے کوٹھری کے دروازے کی طرف دیکھنے لگتی تھیں سن سن کرتے ہوئے کچھ سائے سے اس کے پاس سے گذر جاتے تھے۔ کوٹھری کے دروازوں کی درزوں میں سے کیلٹی کے لمپ کی روشنی۔ اندر جھانکنے لگتی۔ جیسے باہر کوئی پھلجھڑی جلا رہا ہو۔ اور اس کے تارے سے اندر آ آ کر گر رہے ہوں۔ مگر اس کا دل گھبرانے لگتا۔ اور وہ دادی کے نرم نرم لجلجے سے ہاتھ دباتے ہوئے چلا اٹھتی۔ دادی ہاں پھر۔ میری ماں کی کیسی شکل تھی وہ کیسے کپڑے پہنتی تھی؟ ابا سارے روپے اماں کو دیدیتے تھے۔ میرے لئے کیسے کپڑے لاتے تھے۔ ہمارا مکان کتنا بڑا تھا۔

اتنے سارے سوال سن کر بوڑھی کھوسٹ دادی میرا ہاتھ جھٹک دیتی۔ اوہ لڑکی کتنی دفعہ تو تم کو بتایا اور ایک لمبی سی آہ کھینچ کر دادا جان کی تعریفیں شروع کر دیتیں۔ اللہ بخشے تیرے دادا مجھ کو بڑا چاہتے تھے وہ بڑے خوبصورت تھے۔ تیری طرح ان کی بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔ میرا اتنا خیال رکھتے تھے کبھی میرا دل میلا نہیں کیا۔ اونہہ وہ چڑ جاتی اور چپکے سے اپنے گھٹنوں میں اپنا منہ چھپا لیتی۔ اور نہ جانے کب سو جاتی تھی۔ اس کو دادی پسند تھیں۔ وہ خوشی سے ان کا سارا کام کرتی۔ جمعرات کو محلے سے بڑے بڑے آدمیوں کے گھروں سے کھانا بھی لاتی تھی۔ کس لئے صرف اپنے بچپنے کے قصے سننے کے لئے مگر آخری دفعہ دادی اس کا جی جلا دیتی۔ کہانی کا خاتمہ تیرا دادا ایسا تھا ویسا تھا اس کو نہ جانے کیوں اس سے نفرت سی ہو گئی تھی ـــــــ اس کو اب اپنی زندگی سے نفرت تھی۔ کیا وہ شریف نہیں۔ لڑکی تمہارا کیا نام ہے؟ اس کی دنیا، اس شہر یں آواز میں گم ہو گئی۔ وہ چونک پڑی۔ وہی گرم سا کمرہ۔ نرم نرم گرم سے قالین۔ جس کے چاروں طرف سرخ و سفید مسکراتے ہوئے چہرے۔ چاروں طرف قد آدم شفاف سے آئینے جن میں وہ میز اور سرخ و سفید چہرے سے چمکدار پیشانیاں۔ مسکراتے ہوئے گلابی گلابی لب۔ وہ جھنجھلا کر آج مدت بعد آئینے میں خود کو دیکھ رہی تھی ـــــــ اچھی خاصی شکل تھی اس کی۔ گورا گورا کتابی چہرہ۔ بڑی بڑی سیاہ۔ حیران سی آنکھیں جو کبھی کبھی گھنی سیاہ نوکیلی پلکوں میں شرارتاً چھپ جانے کی کوشش کرتیں۔ پتلے پتلے کیوپڈ کی کمان جیسے ہونٹ مگر مرجھائے ہوئے۔ نہ جانے اس کے لب سرخ و تر و

تازہ کیوں نہ تھے۔ جیسے آئینہ میں کانپتے ہوئے سرخ گیلے گیلے چمکدار سے ہونٹ۔ مگر
اس کے اس قدر خشک کیوں ہیں بار بار زبان سے تر کرنے پڑتے تھے۔ نگاہیں
اٹھتے اٹھتے اس کے سیاہ چمکدار بالوں پر پڑیں۔ ہائے میرے بال کتنے اچھے ہیں
لہریں سی بل کھاتی ہوئی لٹیں۔ اس کے سفید سفید رخساروں پر نثار ہو رہی تھیں
سیاہ کھنچے ہوئے ابرو۔ کسی اجڑے کھجڑے مغل خاندان کے نشان معلوم دیتے
تھے سیاہ بالوں کے بیچ میں باریک سی سفید مانگ جیسے گھنگھور سیاہ سی بدلیوں
میں کبھی کبھی سفید باریک سی بجلی تڑپ کر چیخ جاتی ہو ——— سر پر پڑا ہوا ملگجا
سا دوپٹہ۔ ہر بار سرک جاتا تھا۔ کتنے میلے کپڑے ہیں اس کے، اتنے میں دو آنکھیں
برابر اس کو دیکھ رہی تھیں وہ چونک پڑی۔ سفید چمکدار چوڑی سی پیشانی بھورے
بھورے لہروں والے بال۔ نیلی بڑی بڑی چمکدار متجسس آنکھیں۔ کانپتے ہوئے
سرخ گیلے گیلے چمکدار لب بھورے رنگ کا کوٹ۔ جس کا رنگ بالوں کو دیکھ
کر شرما رہا تھا ——— کئی دفعہ سیاہ اور نیلی آنکھوں میں مقابلہ ہوا مگر
سیاہ نگاہیں۔ خود بخود ہار کر۔ گرم گرم قالین میں کھو جانے کی کوشش کرنے لگتی۔
——— تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔ اور ساتھ ہی زور سے کسی کے ہاتھ سے
چمچہ گر پڑا۔ بھورے کوٹ والا مسکرایا۔ اور چمچہ اٹھاتے ہوئے (SORRY) کچھ کہا
جسے وہ خاک بھی نہ سمجھ سکی۔ میرا نام ——— میرا نام عذرا ہے۔ اس کے
ہونٹ کانپنے لگے۔ اور نہ جانے آنکھوں میں کیوں آنسو آ گئے۔ تم کو یہاں کس

نے بھیجا ــــــ چائے کی خالی پیالی رکھتے ہوئے۔ ایک نوعمر حسین لڑکی نے اپنے سرخ ہونٹوں کو بھینچتے ہوئے ـــ پوچھا۔ جس سے سرخ ہونٹ چند لمحے زرد رہنے کے بعد اور بھی سرخ ہو گئے۔ میں خود یہاں آئی ہوں بیگم صاحب میں بہت غریب ہوں میرا کوئی نہیں۔ میرے پڑوس میں ایک لڑکی رہتی ہے۔ اس نے مجھے پتہ بتایا تھا ــــــ اس نے معصومیت سے بڑی بڑی سیاہ آنسوؤں سے لبریز نگاہیں ـــــ اس کی خوبصورت چمکدار پیشانی پر گاڑ دیں دھڑکتے ہوئے دل سے اپنا فیصلہ سننے کے لئے بے قرار تھی ـــــــ

نہیں۔ عذرا تم اتنی اداس کیوں ہو۔ تم کو رکھ لیا جائیگا۔ پروین کا کام کرنا۔ مسکراتے ہوئے اپنی نیلگوں آنکھیں پھراتے ہوئے نیلی فراک والی لڑکی پروین کو گود میں بٹھا لیا۔ کیوں پروین تم کو یہ لڑکی پسند ہے ــــــ آپس میں چار نیلی آنکھیں ٹکرائیں۔ سرخ گیلے گیلے چمکدار ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی ـــــ ایک ننھا سا بھورے بالوں سے ڈھکا ہوا سر۔ نرم نرم سی ریشم کی قمیض سے ٹکرا گیا۔ اور دو دل دھڑکنے لگے ــــــ سنو عذرا۔ بے بی کو صبح شام سیر کو لے جایا کرنا۔ ان کا کمرہ صاف کرنا۔ جاؤ اس کمرے کے برابر کا کمرہ بے بی کا ہے' ان کے سینڈل نکال لاؤ۔ وہ ایک منٹ میں کیا کیا سن گئی۔ سینڈل' بے بی کا کمرہ ـــ نیلی فراک والی بے بی پروین صبح شام سیر کو لے جانا ــــــ گرم گرم قالین قد آدم آئینے۔ سرخ گیلے گیلے چمکدار کانپتے ہوئے ہونٹ۔ چمکدار پیشانیاں ـــ

سرخ وسپید چہرہ، نیلگوں متجسس کھلی کھلی نگاہیں۔ بھورے سے سوٹ والا۔ کانپتی ہوئی انگلیاں۔ زمین پر گرا ہوا چچہ۔ ریشم کی نرم نرم قمیض۔ اتنی نرم جس کی سطح پر دھڑکتا ہوا دل بھی محسوس ہو سکے ــــــ اس کے پتلے پتلے مرجھائے ہوئے ہونٹ ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ اب وہ غلام تھی۔ بھکارن ــــــ کتنا اس کی زندگی میں انقلاب پیدا ہو گیا تھا ــــــ وہ لنگڑاتی ہوئی اٹھی ــــــ اس کے پاؤں ــــــ نرم نرم قالین پر جیسے جم گئے تھے ــــــ اب وہ کمرے سے باہر تھی۔ نہ جانے کس طرح۔ وہ کمرے سے باہر نکل سکتی ــــــ برآمدے کے چمکتے ہوئے ٹائیلز (TILES) جلدی جلدی اس کی خدمت میں پیش ہو رہے تھے۔ وہ ذرا جھکی ــــــ یہ تو اس کا ہی چہرہ تھا ــــــ کتنا خوبصورت وہ مسکرا دی ــــــ بے بی کی شکل سے اس کی شکل کتنی ملتی تھی۔ صرف بے بی کی آنکھیں نیلی تھیں۔ کتنی اچھی آنکھیں۔ اس کا جی چاہا پیار کرے۔ مگر بے بی کے چہرہ پر چمک کسی چیز کی تھی ــــــ وہ آگے نہ سوچ سکی ــــــ

کمرے سے دبے دبے قہقہے باریک ریشمیں پردوں سے ہوا کی مدد سے اس کے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔ لڑکی تو خوبصورت ہے ممی۔ مگر کتنی معصوم۔ یہ آواز بھورے سوٹ والے لڑکے کی تھی ــــــ جن کے متعلق سنا تھا کہ لڑکے تو چار ہیں۔ ایسے سیدھے جیسے اللہ میاں کی گائے ــــــ وہ کانپ اٹھی ــــــ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ کان کی لوئیں جلنے لگیں۔ اس کی نگاہیں بے اختیار

آسمان تک پہنچ گئیں۔ ہلکے نیلے لمبے چوڑے آداس سے آسمان پر دو سفید پرندے ایک دوسرے سے لڑتے ہوئے۔ انار کے پیڑ میں نہ جانے کہاں چھپ گئے ــــ اس کا جی چاہا کاش وہ بھی اسی طرح کہیں چھپ سکتی ــــ

دن بھر کام کرتے کرتے اس کا نازک جسم تھک کر چور ہو گیا تھا ــ مگر بے بی نے اب تک کھانا نہیں کھایا تھا۔ بجلی کی تیز روشنی میں بے بی کی قیمتی نیلی فراک ــ عذرا کو بہت ہی بھائی تھی ــــ وہ سوچ رہی تھی ــــ کہ جب پہلی تاریخ آئے گی۔ تو وہ بیگم صاحب سے پوچھ کر ــــ ایسا ہی فراک خریدے گی کیا وہ بھی پروین کی طرح سے ہو سکتی ہے ــــ مگر وہ تو بے بی پروین کی غلام ہے کیا وہ اس کی برابری کر سکتی ہے ــــ وہ کانپ اٹھی۔ وہ اپنی مالکہ کے خوبصورت پھولدار سینڈل کو تعجب سے دیکھ رہی تھی ــــ اس کا ہاتھ بے اختیار نرم نرم سینڈلز پر تھا ــــ وہ کتنے نرم تھے، ان کا رنگ کتنا اچھا تھا ــ نیلی فراک سے ملتا جلتا ــــ گہرا نیلا۔ جیسے آسمان گہرا نیلا۔ اودی اودی بدلیوں میں گھرا ہوا آسمان ــــ وہ بڑے اطمینان سے ان پر ہاتھ پھیر رہی تھی ــــ اس کی انگلیوں پر دو گرم گرم بوندیں گریں ــــ وہ چونک پڑی۔ آنسو ــــ وہ کیوں۔ وہ خود بھی نہ سمجھ سکی ــــ

وہ اب امیر تھی۔ نوکر چاکر بالکل پروین جیسی تھی۔ ہو بہو وہی ——— اور وہ چمکتی پیشانی۔ نیلگوں آنکھیں۔ سرخ گیلے گیلے کانپتے ہوئے لب۔ سرخ و سفید رنگ، بھورے رنگ کا سوٹ جو اہر دار بالوں سے شرماتا ہوا مجبوراً جسم پہ تھا ——— وہی اللہ میاں کی گائے ——— آج اس نے نیلی فراک پہنی تھی ——— پروین جیسے سینڈل ——— نیلے۔ اودی اودی بدلیوں جیسے گہرے نیلے سیاہی مائل ——— وہ کتنی خوش تھی انار کے پیڑ کے نیچے میز پر گرم چائے پیالیوں میں رکھی تھی ——— جس کی خوشبو اس کے دماغ میں بڑی تیزی سے گھس رہی تھی ——— بے بی پروین کی سریلی آواز نہ جانے کہاں سے آ رہی تھی۔ وہ اس کو ڈھونڈھنے بھاگی ——— اس کا فراک کانٹوں والے تاروں سے پھٹ گیا۔ وہ زور سے چیخ اٹھی ——— میرا فراک ——— سامنے میز پر گرم گرم چائے کی پیالیاں رکھی ہوئی تھیں سب چائے پینے میں مشغول تھے ——— پروین کا ریشمی نیلی فراک کا ربن ہوا میں لہرا رہا تھا ——— وہ خاموش تھی ——— اس نے اپنے اوپر نظر ڈالی اس کا پیوند لگا کرتہ ——— جو کل کے کام کاج میں اور بھی میلا ہو گیا تھا ——— اس کے جسم پر تھا ——— دامن پر ایک سوراخ تھا ——— جس میں اس کی دونوں انگلیاں پیوست تھیں ——— اور جو وہ بے ہوشی کے عالم میں کافی پھاڑ چکی تھی ——— اس کا جی چاہا زور سے چلائے۔ میری فراک کہاں وہ سینڈل وہ کانٹے دار تاروں کی باڑ کہاں۔ جس پہ

سے وہ کودی تھی اور فراک کا دامن پھنس کر پھٹ گیا تھا۔ پروین کی فراک کا کمر میں بندھا ہوا ربن ہوا میں شرارتاً سر اٹھا کر دیکھتا تھا اور ہنستے ہنستے سر جھکا لیتا تھا۔ ارے پگلی وہ تو سب خواب تھا۔ قالین کی گرمی سے صبح کی تھکی ہوئی۔ عذرا نہ جانے کب دوسری دنیا میں پہنچ گئی تھی۔ وہ تو سب خواب تھا۔ اس کو قالین کے نرم نرم روئیں ایسے معلوم ہوئے۔ جیسے وہ کانٹوں دار تاروں پر بیٹھی ہے۔ کھانا ختم کرنے کے بعد اب سب چائے پی رہے تھے اور وہ تو بے بی کے سینڈل صاف کر رہی تھی ــــــ سامنے آئینے میں عذرا کی سوجی ہوئی سیاہ آنکھوں سے جن میں نیند کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جن میں حسرت تھی جن میں آرزو تھی بے کسی مچل رہی تھی۔ نیلی نیلی بڑی بڑی شفاف کھلی کھلی متجسس آنکھیں ٹکرائیں ــــــ گیلے گیلے سرخ لب کانپنے لگے رخسار اور کان کی لویں سرخ ہو گئیں۔ لمبی لمبی انگلیوں میں چائے کی پیالی کانپنے لگی ــــــ مگر چمچہ نہ گرا ــــــ آنکھوں کی نیلاہٹ میں چمکتی ہوئی روشن اودی اودی روشنی ــــــ سیاہ پتلیوں کی روشنی میں سما جانا چاہتی تھی۔ عذرا کو ایسا معلوم ہوا ــــــ جیسے نیلی نیلی شفاف سی گہری گہری چمکدار آنکھوں میں بڑھتے بڑھتے۔ نیلا سا پردہ تیار ہونے لگا چمکدار باریک ریشم سا۔ اس کی آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔ گرم گرم آنکھوں سے دو آنسو نکل پڑے۔ اور نیلی روشنی میں اودے رنگ کی نیلی سی چھوٹی سی فراک آنکھوں کی گہرائی میں ناچنے لگی ــــــ

کس کا مُنہ دیکھا تھا؟

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اب نہ جانے مجھے کیوں چین نہیں لینے دیتے۔ اور پھر کھڑکی سے۔ بارش کی ننھی ننھی بوندیں لٹکتی ہوئی چک سے ٹکرا ٹکرا کر ہوا کے جھونکے کے ساتھ اسی طرح سے میرے پلنگ سے لٹکے ہوئے ہاتھوں پر کبھی کبھی ایسے آ کر پڑتیں۔ جیسے کوئی منہ دھو کر گیلے گیلے ہاتھوں سے میرے منہ پر بوندیں ٹپکا دے اور میں چونک پڑوں۔ جانتے ہوئے سمجھتے ہوئے۔ کچھ یونہی سا کسمسا کر رہ جاتی۔ گلاب کی کانٹوں دار ٹہنیاں جھوم جھوم کر ایسی شوخ ادا سے اٹھلا کر کھڑکی میں جھانکتی اور پھر نازک سی کمر کو موڑ کر اپنے ساتھیوں میں مل جاتی۔ جیسے منہ چڑا کر کہہ رہی ہوں۔ ؎

زندگی زندہ دلی کا نام ہے ؛ مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں

دوسرے کمرے میں دادا جان شاید قرآن شریف پڑھ رہے تھے۔ کہ بھائی جان کے کمرے سے ریڈیو کی اس آواز پر آداب عرض ہم دلی سے بول رہے ہیں اس وقت صبح کے ساڑھے سات بجے ہیں۔ اور نہ جانے وہ حضرت بغیر کسی کا جواب سنے ہوئے بکتے رہے۔ بالکل اسی طرح سے جیسے کوئی مداری ۔ ۔ کھیل شروع ہونے سے پہلے ۔ اپنے ٹوٹے ہوئے سامان کو ایک ایک کرکے نام بتا بتا کے الگ الگ رکھتا جائے ۔ اور اس کے چاروں طرف چھوٹے بڑے ۔ موٹے موٹے گول چہروں کو گول گول ہاتھ تھامے ہوئے ۔ لمبے لمبے، پتلے پتلے مرجھائے ہوئے چہروں کو سہارا دیئے ہوئے ۔ بڑی بڑی گول گول شفاف سی معصوم سی نگاہیں حیرت سے مداری کے چہروں پر گڑی ہوئی چھوٹے چھوٹے منہ کھلے ہوئے ۔ ننھے ننھے دانت آپس میں ٹکرا جائیں ۔ ایسے ہی ہماری نگاہیں کبھی چھوٹے سے ڈبے پر گڑ جاتی ہیں جہاں مدھم روشنی میں کوئی بھی تو نظر نہیں آتا ۔ سانس کے چلنے کی آواز سن سکتے ہیں ۔ جذبات کی تیزی محسوس کر سکتے تھے اور آواز کے ہمراہ ذہنی شکل بھی بن جاتی مگر دوسرے فقرے کے ساتھ پہلی شکل مٹ جانے کے بعد نئی آموجود ہوتی ۔ یہاں تک کہ سر چکرانے لگتا ۔ آنکھیں جلنے لگیں میں یہی سوچتے سوچتے دوبارہ سونے کی کوشش کر رہی تھی ۔ دادا جان کی قرآن شریف پڑھنے کی آواز اب اتنی دیر میں نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی ۔ شاید وہ آہستہ آہستہ ۔ فرحت جہاں بہو کی بھیرویں میں تبدیل ہو گئی ۔ نہ جانے مجھے دادا جان پر کیوں رحم سا آنے لگا ۔ مگر

ساتھ ہی خیال آیا۔ بھلا وہ کیا ڈسٹرب ہو سکتے ہیں۔ انہیں تو یہ بھی نہیں پتا کہ یہ چوتھے تالے میں گا رہی ہے۔ یا اس وقت انہوں نے سرگم میں کیا کمال دکھایا اور طبلے والے کو کہاں آ کے مارا ہے۔ بھلا انہیں ان چیزوں میں کیا تمیز جو وہ یہ سن کر چونک پڑتے اور قرآن شریف پڑھتے پڑھتے زور سے کیا کہتے ہیں۔ چلا اٹھتے۔ مگر اس وقت اس جواب میں پشمین ساڑھی سے ڈھکا ہوا سر نہ جھکتا نظر آتا۔ بلکہ وہی مدھم سی روشنی اور لمبی سی کالی سخت پیچان ہوئی ــــــــــــ ساڑھے ساتھ بج گئے مگر اتنی بات تھی کہ بھیرویں سن سن کے میری بوجھل آنکھیں اور بھی نیند کی بوجھ سے جھکنے لگیں اور میں چاہتی تھی کہ نرم نرم بستر میں ایک کروٹ لے کر ہی سو جاؤں۔ مگر کسی کے نرم نرم ٹھنڈے ٹھنڈے ہاتھ مجھے بری طرح جھنجوڑ رہے تھے۔ ارے بھئی روحی جلدی اٹھو عجیب کاہل لڑکی ہو۔ کل کس زور شور سے وعدہ کیا تھا۔ روحہ کو اسکول میں داخل کرانے چلوں گی اور جناب ابھی تک چارپائی پہ ہی اینٹھ رہی ہیں۔ بھئی میں تنگ آ گئی تم سے ہر دفعہ وقت پر دھوکہ دیتی ہو۔ اب بننے سنورنے میں بھی جناب کو دو گھنٹے لگیں گے۔ مجید کتنی دیر سے تانگہ جوڑ لایا ہے۔ ساڑھے سات بج چکے ہیں اور مجھے بھی دیر ہو رہی ہے۔ میری اپائنٹمنٹ لگ جائے گی۔ ہائے اللہ روحی اٹھو بھی۔ رعنا تیوری پر بل چڑھائے اپنی چوٹی کے چمکیلے عنابی ربن کو مسل رہی تھی۔ اُف لڑکی جلدی اٹھو کیا مزے میں پڑی ہوئی تیز تیز آنکھوں سے گھور رہی ہو ــــــــ میں کہہ رہی ہوں دیر ہو رہی ہے ــــــــ اور رعنا نے

میری نرم نرم باہوں میں زور زور سے چٹکیاں لینی شروع کیں۔ یہ عادت مجھے بڑی بُری معلوم ہوتی۔ میں نے تکلیف سے جان چھڑاتے ہوئے اچھل کر کہا۔ آخر تم اٹھتی کیوں نہیں۔ کل منہ سے پھوٹ دیا ہوتا میں تکلیف نہیں فرما سکتی۔ اُف اللہ کس قدر بیہودہ انسان ہو ——— تنگ کر دیا۔ بھلا آج تم اسکول کیوں جا رہی ہو۔ دیکھو کتنا اچھا موسم ہے ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی ہیں کیا خاک پڑھائی میں دل لگے گا ——— فرحہ کو آج نہیں داخل کرنا چاہیئے۔ میں نے ہنسی کو روکتے ہوئے اپنی انگلی دانتوں میں دبائے ہوئے۔ رعنا کے گورے گورے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھنے لگی ——— بہت بہتر معاف کیجئے میں نے آپ کی نیند خراب کی ایسے اچھے موسم میں ہم جیسے بدمزاق لوگ کیا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ اُف مجھے کس قدر دیر ہو گئی۔ مس ہنی نے میری ایپنڈٹ لگادی ہوگی ——— فرحہ، فرحہ بھئی تم خود چلی جاؤ۔ روحی آج نہیں جا سکتی کیونکہ موسم آج اچھا ہے آج ان کی طبیعت بہار پر ہے رعنا سرخ چہرہ کئے ہوئے اپنی چوٹی کے عنابی ربن کو زوروں میں مسلتی ہوئی شان سے پردہ اٹھا کر نکلنا چاہتی تھی کہ مجھے رحم آگیا۔

سنو۔ رعنا جی۔ ہم چلیں گے رعنا جی خفا مت ہو۔ میں نے اس کے غصّے والے چہرے کو اوپر اٹھاتے ہی قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ——— میں ابھی یہ سفید ساڑھی پہن کر تیار ہوئی جاتی ہوں۔ رعنا جی۔ مجھے دیر نہیں لگے گی تمہاری طرح۔ کیونکہ یہ دو چوٹیاں گوندنے میں کافی دیر لگتی ہے۔ رعنا جی آپ کی طرح اور پھر سوٹ کے ساتھ

میچ کرتے ہوئے زہن نہ ہوتا تو ——— میں بدذوق لڑکی کہلاتی ——— کہو
ناراض تو نہیں سچ مچ کل پانچ منٹ" اذلی فائونڈنٹس" رعنا جی۔ میں نے گرم گرم
ہاتھوں سے سرد چہرہ اونچا کیا۔ چہرہ اب سرخی میں تبدیل ہو گیا تھا سیاہ آنکھوں
میں چمک پیدا ہوگئی تھی۔ اور ایک قہقہہ کے ساتھ رعنا کی ایکٹنگ ختم ہوگئی
تھی۔ اُداسی میں ——— اچھی روحی جلدی سے تیار ہو جاؤ ہم تانگے میں بیٹھتی
ہیں ذرا تمہارے ساتھ جانے میں مزا آتا ہے روحی جی۔ جلدی کرو اب تم، میں برقعہ
پہنتی ہوں وہ تیزی سے بھاگتی ہوئی غائب ہوگئی ——— اب میں عجیب
مشکل میں تھی۔ اب جانا ہی پڑے گا۔ کیا مصیبت ہے یہ، رشتے کی بہن۔ اگر اپنی
بہن ہوتو ڈانٹ ڈپٹ کر چپ کردیں مگر ان کا منانا بھی مصیبت ہے۔ اچھی روحی
ذرا اس کے معنی بتا دو۔ ذرا یہ "آلیس ابا جے" لکھا ہے، پڑھ کر بتاؤ۔ ٹھیک ہے ——
چلو بازار میں شوپنگ کرنی ہے۔ میری جیسی سینڈل لو۔ کتنا اچھا معلوم ہوگا جب ہم
تینوں ساتھ چلیں گے یہ پہنے ہوئے۔ نظر لگ جائے گی۔ تانگہ کی گھنٹی بجی۔ یا اللہ ابھی تو
ساڑھی باندھی ہے کیا منہ بھی نہ دھوؤں۔ خود تو اس قدر میک اپ کر کے گئی ہیں کہ یا
اللہ ہم جب اسٹوڈنٹ تھے تو کبھی بھی کچھ نہ لگایا۔ اور اب بھی جی نہیں چاہتا۔ اور اوپر
سے خطاب ملاکہ جناب تو مردہ دل ہیں کیا ہم بھی اپنی نیچر چینج کرلیں۔ بس بھئی اللہ کس
قدر شریر لڑکی ہے بات بات میں انگریزی کی ٹانگ ٹوٹتی ہے۔ اب مجھے بھی برقعہ
اوڑھنا پڑے گا۔ کیسی غضب کی لڑکیاں ہیں۔ کوٹھی تک منہ پہ نقاب ڈالے سکڑی

ہوئی بیٹھی رہتی ہیں اور کو ٹھی کی حاختم ہو گی اور نقاب ہوا میں لہرانے لگی ـــــــ روحی بھئی آؤ نا ـــــــ میں نے جوڑا ختم کرتے ہوئے جلدی سے برقعہ اوڑھا اور چل دی۔

روحی بی بی آپ آگے آجائیں۔ مجید نے تانگہ کے بیلنس سے مجبور ہو کر چیختے ہوئے کہا۔ نا بابا میں مر بھی جاؤں مگر آپ کے پاس کبھی بھی نہ بیٹھوں ــــ بالکل ایسے جیسے مشتری بائی کے تانگہ میں ان کے استاد جی کوچوان کو چلتے تانگہ میں بیڑی جلا کر پیش کر رہے ہوں۔ اور اوپر سے تحفگی یہ کہ سیاہ برقعہ میں ملبوس ایک محترمہ اگر میری طرح موٹی ہوئیں تو خدا کی پناہ ایک عدد گٹھری رکھی ہوئی ہے جو تانگہ کے ہر ہچکولے پر گرنے کے خوف سے ادھر اُدھر ہل جائے۔ فرحہ بی بی تم بیٹھ جاؤ۔ تم چھوٹی سی تو ہو۔ جاؤ۔ نہیں روحی باجی آخر گھر میں سب سے چھوٹا ہونا ہی غضب ہے کہ جب کچھ نہ بن پڑا تو فرحہ بی بی تم جاؤ۔ تم تو چھوٹی سی ہو۔ آخر میں کہاں کی چھوٹی ہوں۔ حد ہے ایک دو سال آپ لوگوں سے چھوٹی ہوں۔ ہوں تو پندرہ سال کی۔ آٹھویں پاس کر چکی ہوں۔ آخر میں کہاں سے چھوٹی رہی۔ کس قدر باتیں کرتی ہے میں نے دل میں جل کر کہا۔ اچھا بھئی مجید اب تم ہی جانو۔ میں تو آگے بیٹھنے سے رہی۔ رعنا بیگم سے تو کس کی مجال ہے جو ان سے کہا جائے۔ آپ تشریف لے جائیں اور میں نے غصے میں ان کی طرف نظر ڈالی۔ کالے برقعہ میں

سے چمکتا ہوا سفید سرخ چہرہ جو ہنسی ضبط کرتے کرتے بے انتہا سرخ ہو گیا تھا۔ اور
مصلحتاً دوسری طرف رخ کر لیا گیا تھا۔ برقعہ کے باہر نکلی ہوئی عنابی ربن والی زلفیں
اب سفید ہاتھوں میں تھیں آخر بیگم صاحب ہیں کیا خدا نہ کرے کسی کے چٹکی لے لیتا
ہوں مجید نے اپنی سفید مونچھوں کو سنوارتے ہوئے میری آنکھوں میں آنکھیں
ڈالتے ہوئے کہا۔ جان ہی تو جل گئی۔ اس موسم میں ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں کوٹھی
مینہ سے گھری ہوئی تھی۔ گلاب کے بڑے بڑے کھلے ہوئے پھول میری کھڑکی میں
جھانک جھانک کر شاید مجھے ڈھونڈ رہے تھے سرد ہوائیں میرے گرم گرم
رخساروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ ایسا اچھا موسم کالے ریشمیں برقعہ جسم سمیت آپس میں
ٹکرا رہے تھے۔ نرم نرم گدے۔ اور پھر تانگے کے میٹھے میٹھے ہچکولے۔ کاش کہ یہ سفر
کبھی ختم ہی نہ ہو۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ مجید کے سخت جسم جیسا ایک بڑا سا پتھر
اس کے پہلو میں رکھا تھا۔ ایسے اچھے موسم میں۔ آہ بڑھاپا۔ بیچارہ مجید اس کی
چھدری چھدری سفید مونچھیں اور اس کی وہ مایوس نظریں۔ تبھی وہ بڑی بیگم صاحب
کے حضور میں فرما چکے تھے۔ ناہیں بیگم صاحب ہم بچیوں کو لیجا وت ناہیں۔ ہم سچ
کہہ رہے ہیں ناک میں دم آجاوت ہے۔ آگے کوئی بیٹھو ناہی نا چاہے ہے ــــ
بے چارہ مجید۔ ایک موہوم سی امید بھی ختم ہو جاتی ہے۔ جب تانگہ جوڑ کے لاتا ہے
کہ کوئی بی بی میرے پاس بیٹھے گی۔ مگر یہ ظالم بیبیاں مر جانا گوارا کرتی ہیں مگر بیوقوف
سے مجید کے پاس کبھی نہیں بیٹھتیں ــــــــ ایک ہچکولے کے ساتھ ہم اب

اسکول کی گلی میں تھے۔ بس بس ـــــ ارے بس۔ سنتا نہیں۔ ہم تینوں نے چیخ کر کہا مگر وہ انتقام اب لینا چاہتا تھا۔ اجی گھوڑا جب ٹھہرے گا تو جبھی تو رکوں گا وہ چھدری مونچھوں میں مسکرایا۔ اور رعنا کی ربن زور زور سے مسلے جانے لگے۔ احمق ہو جی تم چغد۔ چغد کہیں کا۔ اور رعنا کتابیں سنبھالتی ہوئی اتر بھی چکی تھی۔ روحی تم اب فرحہ کو عربک اسکول میں لے جاؤ۔ خدا حافظ۔ ہرے رنگ کے گیٹ نے ہنستے ہوئے سیاہ ریشم میں ملبوس جسم کو بھینچ لیا اور پھر سنجیدہ ہو گیا۔ جیسا کہ آج کل کے نقش قدم پہ چل رہا ہو ـــــ زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ۔ آخر تھا نا درسگاہ کا دروازہ ـــــ

ہلو روحی مس شرما نے اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا۔ اوہ روحی آج تم کہاں مس قریشی نے اپنے خاص انداز میں اپنی ساڑھی ٹھیک کرتے ہوئے بڑی بڑی شوخ سی نگاہیں میری نگاہوں میں ڈال دیں۔ اور اپنی عادت کے مطابق اپنے خم دار بالوں میں اپنی لمبی لمبی انگلیاں پھیرنے لگی ـــــ رفعت آپا نے اپنی دلچسپ سی اردو کی ٹیچر کو پکارا۔ اوہ روحی۔ ہوں کیوں اچھی تو ہو۔ اور اپنی چھوٹی چھوٹی مگر چمکدار ذہین اور پھر اداس چہرے سے دیکھنے لگیں ناک کا ایک سرا اونچا تھا [illegible] بالکل وہی چیزیں تھی۔ مجھے بے اختیار یاد آگیا۔ کتنا تنگ کرتی تھی اپنی ان دلچسپ ٹیچر کو۔ وہ اردو پڑھا رہی ہیں۔ اور بدقسمتی سے اس روز گھٹا چھا رہی ہو۔ میں اپنے کلاس میں دروازے کے پاس بیٹھتی تھی سب سے آگے ڈیسک ہوتا

تھا۔ مگر جب موڈ میں نہ ہوئی تو سب سے آخر میں کسی لڑکی سے چیلنج کر لیتی تھی۔ گر پکڑی جاتی اور جواب طلب ہوتا۔ آپ نے اپنی سیٹ کیوں چینج کی ہے۔ میرے پاس جواب موجود ہوتا۔ میں اسٹیڈی کرنا چاہتی تھی اس لئے یہاں آ بیٹھی آگے شور ہو رہا تھا۔ اور رفعت آپا پر آن محترمہ کی تصویر بن رہی ہے یا دل گرجے اور یونہی پڑنے لگیں تو طبیعت نیچے پر آ جاتی۔ شعر لکھے جا رہے ہیں کبھی کبھی چونک پڑتی۔ رفعت آپا کی توتلی آواز سے اچھا اب آپ لوگ (جو صاف نہ ہوتا تھا) وقت کی پابندی پر مضمون لکھیں۔ اور میری جان ہی تو جل جاتی۔ کہاں سے یہ مصیبت آ جاتی ہے۔ بلائے ناگہانی بن کر مضمون لکھو وقت کی پابندی پر ——— اس پابندئی وقت نے مجسم گھڑی بنا دیا ہے۔ ان کے چہرہ کو دیکھو کتنا فرق ہو گیا ہے پہلے اداس سا تھا۔ آنکھیں سوچ میں رہتی تھیں بار بار چونک پڑتی تھیں لڑکیوں کو وقت کی پابندی کا مضمون دے کر وہ اپنے دوپٹہ کے کروشیہ کے تیار کئے ہوئے کناروں کو غور سے دیکھنے لگتیں جیسے کبھی دیکھے ہی نہیں کہ کیسے بنائے جاتے ہیں یا قلم کی نوک دانتوں میں دبا کے اپنے کسی چچازاد ماموں زاد بھائیوں کی تلذذی شرارتیں یاد کر رہی ہوں گی۔ جو پڑھانے میں شرما شرما کر اکثر دبے دبے لفظوں میں کہہ جاتی تھیں کہ روحی ہماری کلاس میں بڑی شریر لڑکی ہے۔ بالکل میرے ایک بھائی ہیں چچا کے لڑکے وہ بھی ایسی شرارت اکثر کرتے رہتے ہیں۔ اور جب میں پوچھتی رفعت آپا وہ آپ سے بڑے ہیں۔ وہ اپنی چمکدار چھوٹی چھوٹی نگاہیں میری نگاہوں میں ڈال کر دل ہی دل میں کہتیں تم اصل بات پوچھنا چاہتی ہو۔ اور سرخ

سرخ رخسار پر ہلکے ہلکے چپت لگاتے ہوئے ذرا سیریس ہو کر ہاں دو تین سال بڑے ہیں ہم سب ساتھ ہی کھیلے ہیں۔ اور میں ان کے سرخ چہرے کو دیکھنے لگتی۔ مگر پھر غصہ آتا خود تو اپنے ان کی شرارتوں کا لطف آنکھیں بند کر کے کرسی پر سر ڈال کر اٹھاتی رہتی ہیں۔ اور ہم لکھیں ایسے اچھے موسم میں وقت کی پابندی پر مضمون؟ مگر جب ساری کلاس پر نظر پڑتی تو سب کے سر جھکے ہوئے۔ اور ہاتھ ہلتے ہوئے نظر آتے۔ میں اپنا ڈھال جسم تنگ آ کر ڈیسک پر ڈال دیتی اور ہوا کی خنکی میں بھینی بھینی خوشبو مل کر تھپک تھپک کر سلا دینے پر مجبور کر دیتی۔ روحی! روحی! عقیلہ اپنے موٹے موٹے نرم نرم ہاتھوں سے مجھے تھپک تھپک کر اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اف لڑکی ذرا یہ مضمون پورا کر دو۔ اور آگے نہیں لکھا جاتا۔ بھئی ہم سے اس وقت نہیں لکھا جاتا۔ ذرا بھئی رفعت آپا کی طرف تو دیکھو کیا مزے سے ٹانگیں ہلا رہی ہیں اور نگاہیں گھٹا آلود آسمان پر لگی ہوئی ہیں کسی کی یاد میں آنسو جھلملا رہے ہیں۔ اور میں نے کھسیانے ہو کر منہ چڑا دیا بڑی مچھر بننے چلی ہیں خود کو تو اپنے اوپر کنٹرول نہیں اور سبق پڑھانے چلی ہیں۔ اپنی جیسی مجبور لڑکیوں کو، خود وقت کھو رہی ہیں فضول خیالی محل بنا بنا کر بارش میں بہا رہی ہیں۔ اور ہم کو حکم دیا گیا کہ وقت کی پابندی پر مضمون لکھو بھئی عقیلہ میں نہیں لکھتی ——— اگلے ٹیسٹ میں یہی مضمون لکھوایا تھا۔ ایک ہی سیڑھی پر بار بار چڑھو۔ میں تو نہیں لکھتی۔ ایسی بیوقوف ہیں۔ آج اتنا اچھا موسم ہے اسی پر لکھواتیں؟ کہنے کو دسویں میں پڑھتی ہیں مگر مضمون لکھیں پانچویں کلاس کے۔ ان کے دماغ میں رکھا گیا ہے۔ سوائے نئی نئی صورتوں

کے مزے دار باتوں کے جو اپنے تک ہی محدود رکھیں۔ میرا فلاں کزن ایسا ہے
فلاں ایسا ہے بھاڑ میں جائیں یہ کزن جس لڑکی سے سنو آج میرے کزن نے
فلاں کتاب لا کر دی بڑی اچھی ہے۔ ہم کل فلاں لیکچر میں گئے تھے بھئی خدا گواہ ہے
بڑی اچھی لیکچرر ہے۔ کسی نے پوچھا کون کون گیا تھا۔ جواب کچھ شرما کر ملامی کی طبیعت
خراب تھی۔ میں میری چھوٹی بہن اور ایک کزن ہیں ان کے ساتھ گئے۔ ہائے روحی
مجھے تم بے اختیار یاد آ گئیں۔ ہیروئن اس قدر خوبصورت تھی کہ پکچر ختم ہو گئی مگر اس
کی شکل نظروں کے سامنے پھر رہی تھی۔ اور تمہاری فیورٹ نرملا کے گانے تھے بیک
گراؤنڈ، رفتہ رفتہ سب کی صورتیں دھندلی ہو جاتیں اور نرملا اپنی بڑی بڑی آنکھیں
مٹکا مٹکا کر گردن ہلا ہلا کر گاتی ہوئی سامنے پھرنے لگی۔ آمورے سیاں ڈاڈا آمورے
سیاں ہو ہو جیا کل پائے' چین نہ آئے۔ کتنا درد کتنی معصوم سی آواز ہے ہائے اللہ
میرے منہ سے بے اختیار نکلا ——— ٹن ٹن گھنٹی بجی۔ پریئر کا وقت ہو گیا تھا۔
سب کے سر جھک گئے۔ اور معصوم سے چہرے۔ بڑی بڑی نشیلی نشیلی۔ لمبی لمبی سیاہ
پلکیں صاف سی زمین میں کچھ ڈھونڈنے لگیں ———
گیلے گیلے سرخ سرخ سے لب۔ تھرتھرانے لگے۔ یہ عربک سکول ہے۔ بسم اللہ سے دعا
شروع ہوئی۔ الفاظ سمجھ میں نہ آتے تھے اور ایک قسم کی ہمنگ سی تھی۔ گویا ہر لب
دوسرے لبوں کے محتاج تھے سہارا ڈھونڈ رہے تھے الفاظ کا ——— میں
نے نظر چرا کر فرحہ کی طرف دیکھا۔ عجیب سب کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ فراسیس

سکول میں ایسی دعا تو کبھی بھی نہ ہوئی۔ ترا شے ہوئے بال۔ دو چوٹیوں کی صورت میں باندھے ہوئے بال۔ ساڑھیوں اور فراکوں میں ملبوس خوبصورت جسم۔ شگفتہ چہرہ مگر یہ کیا بات تھی کہ ہر خوبصورت لڑکی کی آنکھوں کے گرد یہ سیاہ سے حلقے کیوں پڑے ہوئے تھے۔ خشک۔ سُرخ۔ گیلے کانپتے لب اور God Save the King. کانپتی ہوئی حلق سے نکلی ہوئی آوازیں۔

اس کمرے میں مسز بیچ بیٹھی ہیں۔ بوڑھی چپراسن نے انگلی سے بتاتے ہوئے خوف سے اُدھر دیکھا اور دبے قدموں سے انگنائی سے باہر نکل گئی اور سامنے کے دروازے سے پھر اسکول میں چلی گئی۔ کمرے میں سے چمچوں کی شیشے کی پیالیوں سے ٹکرانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک قسم کی جھنجھناہٹ سی۔ جس کو سن کر گرم گرم خوشبودار چائے کی پیالیاں۔ آملیٹ۔ ٹوسٹ وغیرہ نظروں کے سامنے گھومنے لگے۔ اور پھر صبح سے کچھ نہ کھانے کے بعد یہاں تک کہ دس بج گئے تھے اسکول صبح ساڑھے سات بجے لگتا تھا۔ اور ہم کو انتظار کرتے کرتے دس بج کر بیس منٹ ہو گئے اور ہمارے منہ میں کھیل تک نہ گئی باز آئی ایسے پڑھنے سے فرحہ نے مُنہ بسورتے ہوئے کہا اور مسز بیچ کو دل ہی دل میں کوستے ہوئے آنکھوں کے آنسو جذب کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مسز بیچ کی انگنائی کا معائنہ کرنے لگی۔ غریب فرحہ میں نے دل ہی دل میں اس کی معصوم شکل دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر آخر وہ غریب

کیسے ہوئی۔ میں بھی تو اس وقت غریب بیچاری تھی معصوم۔ میں نے کونسا ناشتہ کرلیا۔ بیرا، میں نے کمرے سے نکلتے ہوئے بیرے کو آہستہ سے آواز دی اور وہ مسکراتا ہوا آیا۔ جی، اس نے اپنی پگڑی درست کرتے ہوئے کہا۔ ذرا مسز بیچ کو کہدو کہ ہم آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آل رائٹ اس نے ہم سے بے تکلفی کا اظہار کرتے ہوئے تیز تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور کمرے میں مٹکتا ہوا چلا گیا۔ کمرے کا پردہ ہوا میں اڑا اور کمرے کا ایک حصہ نظر آیا۔ مسز بیچ کی آدھی کمر نظر آئی تو یہ میں نے ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے فرحہ کو اشارہ کیا۔ کم بخت کرسی میں پھنسی پڑی ہے۔ لال نائٹ بلاوز میں سے کالے موٹے موٹے بازو۔ اور نیلی ساڑھی اور بلاوز کے درمیان سے سیاہ ابھری ہوئی کمر نظر آرہی تھی۔ کالے کتے کی کمر پر موٹے موٹے کالے کالے ہاتھ محبت سے پھیرتے ہوئے نظر آجاتے تھے اور اس آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ جب تیسری دفعہ ہم نے انتظار کرتے کرتے بیرے کو بھیجا تھا۔ اس وقت گیارہ بجنے میں سولہ منٹ رہ گئے تھے۔ حیرت تھی۔ اتنے موٹے جسم میں سے ایک باریک مگر تیز سی آواز سنائی دی ان کو بولدو۔ ہم نے ایک بار بول دیا ہے۔ ہم ابھی چائے پیتا ہے۔ ہم بزی ہے۔ فجول بات نہیں سننا مانگتا۔ کہدو ان لوگ کو کہ ہمارا گھر سے چلا جائے۔ ہم جب اسکول آئے گا۔ تب ہم سے بات کرنا۔ الّو پاجی جاؤ۔ کون نے کنڈا کھولا تھا۔ جاؤ ان کو بولو چلے جائیں کوئی مرد نہ ہوتا تو اس بگڑی ہم کو ایسا ٹھیک کرتی کہ یاد کرتی مگر جل بھن کر رہ گئی فرحہ کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ غریب بچی۔ مگر میں نے بھی اونچی آوازیں

کہدیا کہ اس ادارے کے عجیب ممبر ہیں جو ایک مسلمان اسکول کی کالی سی بدذوق چڑیل
سی عیسائنی پرنسپل رکھی ہے۔ جو سیدھے منہ بات کرنی ہی نہیں جانتی۔ کم بخت
اب کبھی نہیں آئیں گے تیرے اسکول میں۔ فرحہ نے بھی جل کر ذرا آہستہ سے کہا
اور کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے ہم لوگ باہر تھے۔ ٹانگہ میں بیٹھ کر میں نے نقاب
ڈال لی اور جلتنا رویا گیا خوب روئی اس دنیا میں کیسے ذلیل لوگ رہتے ہیں۔ کتوں
سے زیادہ ذلیل جو کتے اور آدمی میں فرق نہ سمجھیں اور میں ضبط نہ کر سکی ہچکیاں بندھ
گئیں۔ ہائے روحی باجی فرحہ نے اپنی آنسوؤں سے لبریز نگاہوں سے میری نقاب
کے اندر جھانکتے ہوئے دیکھا۔ اور خود بھی روتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئی۔ جیسے میں
بیوہ ہو گئی ہوں اور میری چھوٹی بہن کسی دوسرے شہر سے آکر صدمے کی تاب
نہ لا کر ٹانگے ہی میں لپٹ کر پرسے دے رہی ہو ——— اور مجید نے اپنی بھدی
بھدری موچھوں سے پیلے پیلے سرخ دانت نکالتے ہوئے گھبراہٹ میں پوچھا۔
اے بیٹا کیا ہو گیا۔ دشمنوں کی طبیعت کیسی ہے۔ کیا گر پڑیں ——— اور میں اُبل
بھن کر چپ ہو گئی ——— اور میں سوچتی رہی کہ نہ جانے صبح کس کا منہ
دیکھا تھا؟ ———

کیا دستورِ دنیا یہی ہے

شمیم اپنی ذرا یہ کپڑے دھو لینا۔ شمیم نے گھڑی کی طرف اپنی مخمور نگاہیں ڈالتے ہوئے شکستہ لہجے میں کہا۔ اچھا! بیگم صاحبہ اس کا دل بھی گھڑی کی ہلکی آواز کا ساتھ دے رہا تھا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ مگر شمیم اپنے تھکے ہوئے قدموں کو آہستہ آہستہ اٹھانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے ــــــ کمرے سے باہر تھی ــــــ

اس کے بازو شل ہو چکے تھے۔ نازک انگلیاں سرخ ہو چکی تھیں ــــ رسّی تقریباً کپڑوں سے پُر ہو چکی تھی ــــــ ٹھنڈی ٹھنڈی مدہوش و مست ہوا کے جھونکے اس کو کہیں اور لے جانا چاہتے تھے ــــــ بندھے ہوئے بال اب اس کے رخساروں کو محبت سے بار بار پیار کر رہے تھے ــــــ صحن

میں چاروں طرف چاند کی اداس چاندنی پھیلی ہوئی تھی ـــــ کمروں سے سکون کی نیند میں مدہوش تیز تیز سانسوں کی آواز بار بار شمیم کو چونکا دیتی تھی۔

وہ اس وقت بالکل تنہا تھی ـــــ اس کا ساتھی اس وقت وہی تھا ـــــ وہ جسے ـــــ وہ دیوتا تصور کرتی تھی ـــــ سچ بھی تو تھا ـــــ اس دنیا میں اس کا ساتھی ایک بڑا سیاہ پتھر تھا ـــــ جس پر وہ اس وقت تھک کر بیٹھ گئی تھی ـــــ وہ اس سے بہت مانوس تھی ـــــ یا پھر وہی ـــــ اس کے تخئیلات کی دنیا کا مالک ـــــ وہ گھنٹوں ـــــ اسی خیال میں کھوئی رہتی تھی ـــــ کیا وہ ـــــ وہاں تک پہنچ سکتی ہے ـــــ وہ سوچتی ـــــ کیا وہ دنیا بھی اتنی سنگدل ہے ـــــ نہیں ـــــ کبھی نہیں ـــــ وہ دنیا معصوم و پاکیزہ نظر آتی ہے ـــــ وہ دیکھتے دیکھتے تھک جاتی اور اس کی اداس آنکھیں ـــــ ناامیدی سے اس سیاہ پتھر پر جم جاتیں ـــــ اس کی اس معصوم ادا پر ننھے ننھے شوخ چمکتے ہوئے ستارے بھی تڑپ جاتے ـــــ کیا وہ اس کی مدد کر سکتے تھے ـــــ کیا ان میں بھی دکھاوٹ کی رنگینی تھی ـــــ اس کا دماغ چکرانے لگتا اور بے اختیار اس کی نازک انگلیاں سیاہ پتھر پہ التفات کی منزلیں گننے لگتیں۔

وہ چونک پڑی ـــــ کیا ـــــ وہ کہاں ہے ـــــ اس کی

حسین و معصوم دنیا —— جس میں وہ ابھی ابھی سرگرداں تھی —— وہ کتنی مسرور تھی —— اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں نہ جانے کیسے پرنم ہوگئی تھیں —— اس کا سفید پاکیزہ چہرہ نہ جانے کیوں سرد ہوگیا تھا —— شاید شب کی دیوی اپنے منتشر بالوں کو سنوارتے ہوئے اس کے قریب سے گذری ہو —— اس کی شفاف چمکتی ہوئی پیشانی کو شاید محبت سے چوما ہو —— اور سحر شوخ کی آمد کی خبر پاتے ہی شاید گھبراہٹ میں اس کی نازک مالانہ ٹوٹ گئی ہو جس کے —— کئی چمکدار موتی اب تک اس کی پاکیزہ پیشانی اور سیاہ بالوں پر چمک رہے تھے —— کیا وہ پھر ایسا ہی پرسکون حسین خواب دیکھ سکتی ہے —— مگر نہیں —— وہ پھر اسی رنگیلی دنیا میں آگئی تھی —— جس کی ہر رنگین تصویر —— مصور کا شاہکار تھی —— مگر کاغذ پر —— صرف دھوکا تھا۔ وہ اس دنیا سے بھاگ جانا چاہتی تھی —— اس دکھاوٹ کی دنیا سے جس کی بنیادیں صرف دھوکے کی رنگین دیواروں پر رکھی گئی تھیں —— کیا وہ ان رنگین نقوش پر اعتماد کر سکتی تھی جو کہ مکانوں کے شاندار ستونوں پر بنائے جاتے ہیں —— اور پھر برسات کے بعد دوبارہ رنگ پھیرا جاتا ہے ... —— کبھی نہیں —— آہ اس کی معصوم دنیا —— مگر وہ تو اپنی اسی جگہ پر بیٹھی تھی —— وہی سیاہ پتھر —— اس کا

ساتھی اب رخصت ہونے والا تھا ـــــ اس کی اُداس نگاہیں اپنے حسین مصور کے دلکش زندہ شاہکار کو ایک بار پھر دیکھنا چاہتی تھیں ـــــ مگر اس کا پریشان چہرہ ہوا کے سرد تیز جھونکوں سے سیاہ بادلوں میں پوشیدہ ہو گیا ـــــ

آج وہ کتنی تھکن محسوس کر رہی تھی ـــــ مگر مالک کی خوشی کا صحیح راز یہی تھا ـــــ وہ کتنی مغموم تھی۔

دنیا، حسن، غرور، محبت، نفرت، سب سے مانوس تھی ـــــ اس کو سب سے نفرت تھی ـــــ اس کے ہاتھ میں سالن کی بھری ہوئی رکابیاں تھیں۔ وہ دھولے ا رہی تھی ـــــ قریب کے کمرے سے مسرت سے پُر قہقہے ـــــ ہوا کی مدد سے اس کے کانوں تک پہنچ رہے تھے ـــــ وہ تو آج تک اتنا نہ ہنسی ہو گی ـــــ کیوں نہ ہنسی؟ وہ خود بھی آگے نہ سوچ سکی ـــــ

برتن کافی دھل چکے تھے ـــــ دو ایک باقی تھے ـــــ سامنے ٹوکرے میں رکھے ہوئے برتن اب کیسے چمک رہے تھے کیونکہ وہ دُھل چکے تھے ـــــ اور نازک پاک انگلیوں سے صاف کئے گئے تھے اس نے ایک رکابی کو صاف کرتے ہوئے منہ کے قریب لاکر سونگھا، اب اس میں بُو نہ تھی ـــــ یکایک اس کو اپنی شکل چمکتی ہوئی

رکابی میں نظر آئی۔ انسان کی زندگی سے کتنی ملتی جلتی تصویر تھی۔ جب انسان کو گناہ کرتے کرتے ہوش آتا ہے تو اس کی حالت سالن کی بھری ہوئی رکابی جیسی ہوتی ہے۔ جس میں سے بو آنے لگتی ہے۔ لیکن جب اس کو پاکیزہ ہاتھوں سے دھویا جائے۔ تو اس کی گندگی ایک نالی میں یا برتن دھونے کے تسلے میں جمع ہو جاتی ہے۔ اور دھل کر انسان کا ظاہر و باطن صاف نظر آجاتا ہے جس میں سے ہم اپنی دلی کیفیت کو خود دیکھ سکتے ہیں۔ کاش کہ ایسا ہو——— دو ایک برتن باقی رہ گئے تھے ———

سامنے پھولوں کی کیاریوں میں سے دو مرغیاں آپس میں لڑتی ہوئی نکلیں ایک بہت موٹی اور خوبصورت تھی شاید وہ مالک تھی ——— ان میں بھی مالک و آقا کا امتیاز رکھا جاتا ہے کیا یہ حقیقت ہے؟ ——— کالی بڑی مرغی اٹھلاتی ہوئی ——— غرور سے قدم اٹھاتی ہوئی آرہی تھی ——— کمزور چھوٹی مرغی پیچھے پیچھے تھی ——— گھاس پر آکر رک گئی ——— بالکل اسی طرح جس طرح شمیم کی بیگم سیر کرنے کے لئے جاتے وقت اس کو اپنی چیزیں دینے کے لئے رک جاتی تھیں ———

دنیا ——— کیا ان جانوروں میں بھی اس چیز کا امتیاز رکھنا پڑتا ہے ——— بڑی مرغی نے شان سے پیچھے مڑ کر دیکھا ——— غریب سدھی ہوئی مرغی اشارے کو سمجھ گئی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے خوبصورت مرغی

کے چمکیلے پروں سے کھیل رہے تھے۔ اور کمزور مرغی باریک سی چونچ سے اس کی کھال کو کھجا رہی تھی۔ نرم نرم ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس کی ٹھنڈک پنجوں کے ذریعہ اس کے دماغ میں ٹھنڈک پہنچا رہی تھی۔

جھاڑیوں میں حرکت ہوئی اور دو لڑکے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے ہوئے آئے۔ ایک کے گلے میں رسی تھی اور دوسرا رسی کو پکڑے ہوئے ایک لکڑی سے مارتا ہوا آ رہا تھا ——— شمیم کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔ آہ میرا بھیا۔ وہ چیخ پڑی۔ اسلم بھیا کیوں مارتے ہو ——— چپ رہو جی ہم گھوڑا گھوڑا کھیل رہے ہیں ——— چل ناصر ——— ناصر لکڑی کے پڑتے ہی بھاگنا چاہتا تھا ——— مگر قدم زمین پر تھے ——— اور التجا بھری نگاہیں شمیم پر ——— غریب بہن کیا کر سکتی تھی ——— اس کا یتیم معصوم بھائی اس کے جگر کا ٹکڑا تھا ——— مگر آہ وہ نوکر تھا۔ اور وہ آقا ——— ایک، دو، تین، تیسری لکڑی پر ناصر بے تحاشا بھاگتا ہوا نظروں سے غائب تھا ——— نازک نازک جھاڑیاں اب تک لرز رہی تھیں۔ معصوم کلیاں ——— اپنے جیسے معصوم پر ظلم ہوتے دیکھ کر پتوں میں منہ چھپا کر ——— بارگاہ ربی میں دعا مانگ رہی تھیں، سامنے دونوں مرغیاں بھی غائب تھیں۔ تیز ہوا کے جھونکے ——— بدن میں کپکپی پیدا کر رہے تھے ———

شمیم کے ہاتھ کانپ رہے تھے ——— دفعتہً میلے پانی میں جب
پر چکنائی کی تہہ جمی ہوئی تھی ——— دو سفید پانی کے قطرے گرے،
شمیم چونک پڑی۔ کیا آنسو ——— مگر آہ ان کی کوئی قیمت نہ تھی، پانی
کے قطروں سے چکنائی کی تہہ پر ذرا سی حرکت ہوئی اور وہ پھر ویسی ہی جم گئی
آہ کیونکہ وہ بھی تو ایک غریب یتیم اور نوکر کے آنسو تھے ——— کمرے
سے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں ——— دوسری طرف گراونڈ میں
کسی کے رونے کی آواز آ رہی تھی ——— شاید وہ ناصر تھا . . . .

گولیاں

دیکھو بابا گوڑیاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاہا ——— گوڑیاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرا لال
کھیلا کرتا تھا ان ننھی ننھی مٹی کی گوڑیوں سے۔ میرا اسلیم ——— میرا بچہ
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاہا ۔ ۔ ۔ ۔ گوری گوری ننھی ننھی ہتھیلیوں پر رکھ کر بھاگا، بھاگا
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے پاس آتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھئے ۔ ۔ ۔ ۔ ایسی ۔ ۔ ۔ ۔
گوڑیاں ——— میرا اسلیم ——— وہ دیوانوں کی طرح قہقہے لگا رہی تھی ——
نرم نرم قالین پر مٹی میں بھرے ہوئے پیر پھیلی ہتھیلی پر ننھی ننھی مٹی کی گوڑیاں
کانپتے ہوئے ہاتھ پر آپس میں گلے مل رہی تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سفید سر کا رخ
مٹی میں بھرے پیروں کی طرف تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عینک کے دائروں میں سے
جھانکتی ہوئی۔ بے نور سی آنکھیں اُن نرم و نازک پیروں کی۔ نزاکت

پر غور کر رہی تھیں۔ یہ پیر پہلے پہل اُس وقت اُس نے دیکھے تھے۔ جب وہ تھکا ہارا ریل کا سفر طے کر کے اپنے کمرے میں گھسا تھا۔۔۔۔ جہاں صرف عورتیں ہی عورتیں تھیں۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پلنگ پر سے سفید کپڑے کو اٹھایا تھا ——— جس میں سے پہلی دفعہ ننھے ننھے سرخ چھوٹی چھوٹی انگلیوں والے پیر نظر آئے تھے۔ ان پیروں کی اس نے کتنی حفاظت کی ہے۔ چھوٹے چھوٹے مٹی میں بھرے ہوئے پیروں نے اکثر اس کے سفید اجلے کپڑوں کو بھی میلا کیا تھا ——— پھر ایک روز یہی پیر بڑے اور خوبصورت ہو گئے تھے۔ اس کے وہ پیر بہت بھاری لگتے تھے، بہت بھاری ——— مگر وہ اُن بھاری پیروں کو بدستور اٹھائے ہوئے تھا۔ کیونکہ وہ ڈرتا تھا، خوفناک تنہائی سے۔ ان ہی پیروں کی بدولت جب وہ پہلے پہل دنیا میں آئے تھے اس کی زندگی کا سہارا دنیا سے اٹھ گیا تھا ——— قدرت نے اسے ننھے ننھے دو پیر دیئے تھے تسکین تو خیر ہو گئی تھی اُسے، اس کی ٹھوس زندگی میں ایک خلا پیدا ہو گیا تھا۔ جیسے وہ ننھے ننھے پیروں سے پُر کرنا چاہتا تھا ———

اب وہ خلا پُر ہو گیا تھا ——— گھر بار۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دنیا والے اُسی پر ہنستے تھے۔ اس کا دھڑکتا ہوا دل۔ کسی بوجھ سے دبتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ دھڑکتے ہوئے دل کی دھڑکنوں میں اب کوئی

حائل ہو گیا تھا۔ جس سے رفتار سست ہو گئی تھی۔ اس کے بازو ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ اتنے کمزور کہ وہ بوجھل پیروں کو نہ اٹھا سکتے تھے۔ ان کا بوجھ اب کسی مضبوط بازوؤں کو اٹھانا چاہئے۔ اسی خیال سے وہ کانپ جاتا تھا۔ سوچتے سوچتے اس کا سیاہ سر بالکل سفید ہو گیا تھا ——— آخر ایک روز وہ بوجھل پیر سفید نرم و نازک سے ہو گئے سفید پیر مہندی سے سرخ کئے گئے ——— مگر اس کے کمرے ویران ہو گئے۔ سنسان سی کوٹھی میں اس کا دم نکلنے لگا۔ مدت تک اس کے کانوں میں دور کہیں قہقہے گونجتے رہے۔ اس کی زندگی پر سیاہ تاریکی کے پردے پڑ گئے۔ ماضی کے ہچکولوں سے پیروں میں جنبش ہوتی اور سیاہ تاریکی میں باریک سا خلا نمودار ہو جاتا اس خلا میں کبھی ننھے ننھے پیر سرخ سے سفید کپڑے میں سے جھانکتے نظر آتے۔ کبھی لکڑی کے رنگین گڈو لنے کے ساتھ ساتھ اٹھتے ہوئے گوشت سے اُبھرے ہوئے۔ پھر وہ کتنے بوجھل ہو گئے تھے۔ دنیا اس پر ہنستی تھی شاید وہ اس کی پُرسکون زندگی نہ دیکھ سکیں۔ اس سوچ میں سیاہ سر سفید اور سفید پیر رنگین ہو گئے ——— مگر کچھ ہی مدت بعد مضبوط بازو رنگین پیروں کو نہ اٹھا سکے دنیا کی نظر لگ گئی ——— قدرت نے مضبوط بازو ہمیشہ

ہمیشہ کے لئے چھین لئے ـــــ سفید سر اب جھک گیا ـــــ
سرخ رنگین پیروں کی مہندی اب پھیکی پڑ گئی تھی ـــــ کمروں میں
اب سیاہ پردے پڑ گئے تھے۔ شام کو اکثر پردوں کے پیچھے سے سسکیوں
کی آوازیں تھر تھراتی ہوئی چھت سے ٹکرا جاتیں ـــــ سفید سر
بھی جھک جاتا۔ کھردرے جھریوں دار رخساروں پر آنسو بہنے لگتے۔ مگر
اب اس کا دل نہ گھبراتا۔ سیاہ پردوں میں جنبش ہوتی اور زرد کمھلایا
ہوا پریشان بالوں میں سے جھانکتا ہوا چہرہ نظر آجاتا۔ بابا ......
ہونٹ کانپتے اور...... زرد سے رخساروں پر آنسو بہنے لگتے .....
اس چہرے کے ساتھ ہی ایک سرخ و سفید معصوم سا چہرہ سفید سر
کو دیکھ کر بے اختیار کھِل اٹھتا گیلے گیلے سرخ ہونٹ گول سا دائرہ
بنا لیتے ـــــ ننھے ننھے گول گول ہاتھ، سرخ سرخ چھوٹے چھوٹے
پیر سفید سر کی طرف بے اختیار بڑھ جاتے ـــــ زرد چہرہ کھِل
جاتا۔ بابا........ سلیم کو لے لیجئے .... کمزور سے بازو ننھے
سے سلیم کو بھینچنے کی کوشش کرتے۔ مگر قدرت نے ان کمزور سے
بازوؤں سے بھی ننھا سا پھول چھین لیا ـــــ زرد چہرہ اب کبھی
بھی نہ کھلتا اس کی مسکراہٹیں سیاہ کپڑوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے
پوشیدہ ہو گئیں۔ نہ جانے وہ اب نیلے نیلے چمکیلے آسمان کو گھنٹوں کیوں

گھورتی رہتی۔ گیلی گیلی نرم ابھری ہوئی مٹی۔ جو زمین کی سطح پر کبھی اُبھر
آتی تھی۔ پھولی ہوئی۔ جیسے کسی دیوار پر برسوں سے سفیدی نہ ہوئی ہو۔
اور مسلسل بارش کے بعد دھوپ نکلنے پر گرمی سے چونے کی باریک
باریک سی تہیں کیسی الگ سے گر پڑتی ہیں۔ اس کا اب یہی مشغلہ تھا۔
چپکے سے سب کی نظروں سے اوجھل ہوئی اور سیدھے باغیچہ کی میلی کچیلی
دیواروں کی میلی سیاہ سی سفیدی کو جو اب سفیدی سے سیاہ ہو گئی
تھی۔ بکل کے بکل اپنے لمبے لمبے ناخونوں سے کھرچنے لگتی ——
اس نے لمبے چوڑے باغیچے کی سیاہ سی سیلی ہوئی دیواروں کو ——
جن پر کئی قسم کی پھپھوندی سی لگ گئی تھی —— سیاہ سی دیواریں
اب لال لال اینٹوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ گیلی گیلی ٹھنڈی سی سرخ
سرخ کھردری سی اینٹیں۔ وہ اپنی لمبی لمبی پیلی پیلی کانپتی ہوئی انگلیاں
پھیر رہی تھی۔ اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس کا جی چاہا کہ دانت سے
توڑ لے۔ ایک سرخ سی اینٹ کا کنارہ۔ مگر بڑی سخت تھی اینٹ۔
نہ جانے اس کا دل اندر سے کیوں مچلنے لگا۔ جیسے کوئی چیز گھبرا گھبرا کر
پھڑپھڑا رہی ہو۔ آخر اس نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے چپکے سے گیلی
گیلی کھردری سرخ سرخ سی اینٹ پر اپنی بھیگی ہوئی زبان پھیر ہی دی۔
اس کے ہونٹ چھل گئے مگر منہ میں بے حد پانی جمع ہو گیا تھا ——

کتنا اچھا مزا تھا ــــــ وہ اپنے منہ کا پانی حلق کے نیچے اتارنے لگی۔
نہ جانے اس کو ایسا کرنے میں کیا مزا آتا تھا ــــــ باغیچے میں وہ
چپکے سے چلی جاتی ــــــ کیاریوں کے کنارے مٹی میں اپنے گرم
گرم جلتے ہوئے پیر دبائے گھنٹوں بیٹھی رہتی ــــــ سوکھی سوکھی مٹی
کی گول گول گولیوں کو وہ اپنی لمبی لمبی کمزور سی انگلیوں میں دبا کر زور سے
بھینچ دیتی۔ گھنٹوں اسی سوکھی سی مٹی کو مسلتی رہتی۔ جب تک وہ پاؤڈر کی
صورت میں نہ ہو جاتی۔ وہ مسلتی رہتی۔ کیاریوں میں ٹھہرے ہوئے پانی کا
چلو بھر کے اس مٹی پر ڈالتی۔ کتنی اچھی سوندھی سوندھی سی خوشبو آتی تھی۔
وہ دیوانی سی ہو جاتی تھی۔ خود بخود بولنے لگتی۔ بیوقوفوں کی طرح ہنسنے لگتی،
گیلی گیلی مٹی اٹھا اٹھا کر درختوں پر بیٹھی ہوئی چڑیوں پر پھینکتی۔ نرم نرم
گیلی گیلی ٹھنڈی ٹھنڈی مٹی پر کپڑوں سمیت لیٹ جاتی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی
مٹی اٹھا کر اپنی جلتی ہوئی آنکھوں پر لگاتی۔ اس وقت اس کا چہرہ کتنا
زرد پڑ جاتا۔ خشک پھیکے پھیکے سے ہونٹ کانپنے لگتے۔ زرد مرجھائے
ہوئے رخساروں پر آنسو بہنے لگتے۔ پاگلوں کی طرح سے وہ نیلے
نیلے چمکیلے آسمان کو گھورنے لگتی۔ جہاں اس کا بوجھ اٹھانے والے مضبوط
بازوؤں کی طاقت جذب ہو گئی تھی۔ اسی طاقت کے بدلے میں اس
نیلے نیلے آسمان نے اسے کیا دیا تھا ــــــ کالی کالی سیاہ راتیں،

سنسان سے دن۔ وہ جدھر دیکھتی سیاہی سیاہی ہی اُسے گھیرے رہتی۔ نیلے نیلے پردے کے پیچھے اس کا سکون اس کی نیندیں اس کا سکھ اس کی زندگی ـــــــ اس کی امیدیں جس کے سہارے وہ دوبارہ جینا چاہتی تھی ـــــــ چھوٹا سا معصوم سلیم۔ وہ بھی مضبوط بازؤں میں کھنچا چلا گیا ـــــــ اب کیا تھا اس کا اس سیاہ سی دنیا میں ایک سفید سر۔ جس کے سائے میں اس نے بچپن گذارا۔ لڑکپن گذارا پھر اب جوانی بھی کچھ گذر چکی ـــــــ اس نے الگ راہ اختیار کی لیکن فطرت کو شاید ذرا بھی نہ بھائی وہ راہ۔ آخر پھر اس سفید سر کے سائے میں وہ سیاہ لباس میں ملبوس ڈو جانوں کا صدمہ اپنے سینے میں چھپائے ـــــــ اس مٹی سے کھیلتی رہے گی ـــــــ جس میں اس کی زندگی کی دو نشانیاں پوشیدہ ہو گئیں ـــــــ

نرم گیلی مٹی پر لیٹے لیٹے۔ اپنی لمبی کمزور سی انگلیوں سے سوندھی سوندھی مٹی کھودنے لگتی ـــــــ نہ جانے کیا سوچتے سوچتے وہ آنسو بہانے لگتی ـــــــ ہونٹ آہستہ آہستہ ہلتے۔ چہرہ سرخ ہو جاتا ـــــــ تیزی سے مٹی کھودنے لگتی ـــــــ کھودتے کھودتے ایک ننھا سا گڑھا کھود لیتی ـــــــ اسی میں پاؤں پھیلا کر۔ چمکتے ہوئے سورج کو۔ دیر تک دیکھتی رہتی۔ مرجھایا ہوا چہرہ سرخ ہو جاتا سوکھے ہوئے

ہونٹ کانپنے لگتے۔ پسینے کی بوندیں ماتھے پر چمکنے لگتیں ہاتھ پیر ڈھیلے
پڑ جاتے۔ نہ جانے کیا سوچتی رہتی۔ چھوٹی چھوٹی نڈر چڑیاں بھی تو اس کو
چپکا بیٹھا نہ دیکھ سکتی تھیں۔ اس کے الجھے ہوئے بالوں میں اڑتے
ہوئے۔ تنکے۔ روئی۔ سوکھے ہوئے پتے اور نہ جانے کیا کیا اس
کے پریشان بالوں میں پھینک جاتیں ــــــ اس ہی پر کیا منحصر
آٹھ نو ل کر۔ اس کے چاروں طرف اڑتے ہوئے خوب چیختیں
اتنا شور کرتیں کہ وہ بیزار سی ہو کر ان کے پیچھے بھاگتی۔ اور گیلی گیلی
مٹی مٹھیوں میں سے کر ان پر پھینکتی۔ مگر وہ ننھی ننھی جانیں۔ دھڑکتے
ہوئے دل سے کر۔ اپنی فتح کی خوشی میں چوں چوں کرتی ہوئی، آسمانی
فضاؤں میں بہتی چلی جاتیں دور بہت دور۔ نرم سفید سفید بادلوں میں
کالے کالے دھبے غائب ہو جاتے۔ وہ دیر تک ٹکٹکی باندھے
انہیں دیکھتی رہتی۔ حسرت بھری نگاہوں سے۔ شاید اس کا دل
بھی چاہتا ہو۔ کہ میں بھی ایسی ہی اڑتی ــــــ مگر وہ جھنجلا کر اپنا
مشغلہ شروع کر دیتی۔ کھودے ہوئے گڑھے میں کھلے ہوئے پھول
ہری ہری ٹہنیاں۔ غنچے توڑ توڑ کر ڈالتی ــــــ جب تک گڑھا
پر نہ ہو جاتا پھر وہ جھک کر ان پھولوں کو سونگھتی۔ اس کا چہرہ سفید پڑ جاتا
آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگتے۔ وہ گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھتی مگر

وہ شریر نڈر چڑیاں تک بھی وہاں نہ ہوتیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی سی ہوا بھی بند ہو جاتی۔ سائیں سائیں سی اس کے کانوں میں ہونے لگتی۔ وہ دیوانوں کی طرح چاروں طرف ڈر ڈر کر دیکھتی خوف سے سہمے سہمے پھر ایک دفعہ گڑھے میں پڑے ہوئے پھولوں کو اٹھا کر چومتی ٹھنڈی ٹھنڈی ہری ٹہنیوں کو چومتی گرم چہرے پر آہستہ آہستہ سہلاتی ——— جھلملاتے ہوئے آنسو رخساروں پر بہنے لگتے۔ آنکھیں سرخ ہو جاتیں۔ وہ پھولوں کا منہ اپنے آنسوؤں سے تر کر دیتی۔ پھر آسمان کی طرف گھورنے لگتی۔ وہاں کچھ بھی تو نہ ہوتا تھا۔ نیلا آسمان جہاں روئی کے گالے جیسے سفید سفید بادلوں کے ٹکڑے اور کالے کالے دھبوں کے سوا کچھ بھی تو نہ تھا۔ نہ جانے وہ کیا ڈھونڈھتی تھی۔ اس نیلے پردے کے پیچھے۔ گھنٹوں اسی طرح گذر جاتے تھے۔ تیز دھوپ میں وہ سرخ ہو جاتی۔ پسینے میں تر بتر، ہونٹ ہلنے لگتے۔ نہ جانے کیا بڑبڑاتی۔ سینے سے لگائے ہوئے پھولوں کی ہری ٹہنیوں کو زور سے گڑھے میں پھینک دیتی پھر تیزی سے اس میں مٹی بھرنے لگتی۔ دبا دبا کر محنت سے گڑھا پر کر دیتی جیسے بہت ہی ضروری کام کر رہی ہو۔ یہاں تک کہ ایک اونچی سی چھوٹی سی قبر بنا لیتی۔ پھر محبت بھری نگاہوں سے اسے گھنٹوں دیکھتی رہتی جیسے اسے نیند آ رہی ہو ——— سرخ چہرہ سفید پڑ جاتا۔ کیاریوں میں

ٹھہرے ہوئے پانی سے اونچی چھوٹی سی قبر کو لیپنے لگتی۔ مسکرا مسکرا کر اُسے
محبت بھری نگاہوں سے دیکھتی۔ پھر بھاگتی ہوئی۔ ڈھونڈ ڈھوند کر
سوکھی ہوئی ٹہنیاں لاتی۔ خاردار جھاڑیاں توڑ توڑ کر لاتی۔ بھاگتی ہوئے
قہقہے لگاتی۔ بدحواسی سی ایسی گھبراہٹ میں جیسے اُسے بہت کام کرنا ہے
کیاریوں میں بھاگتی ہوئی۔ نرم کونپلوں کو چھوٹی چھوٹی ٹہنیوں کو پیروں
سے روندتی ہوئی۔ آتی۔ چھوٹی سی اونچی قبر پر خاردار جھاڑیاں لگاتی کبھی
کانٹے اس کی لمبی لمبی پیلی انگلیوں میں چبھ جاتے مگر جیسے اسے تکلیف
ہی نہیں ہوتی۔ پھدپکا پھدپکا خون رسنے لگتا۔ لیکن وہ پھر چھوٹی سی قبر
سجانے میں منہمک ہو جاتی۔ سوکھی ہوئی پتیوں کا چورا چورا کر کے قبر پر
بکھیر دیتی۔ مسکرا مسکرا کر کتنی تیزی سے وہ یہ سب کرتی ———
کیاریوں کے پاس کئی چھوٹی بڑی ٹوٹی ہوئی بے ترتیب سی قبریں بنی
ہوئی تھیں۔ جن پر باریک سی لکیریں پڑی ہوئی تھیں جیسے کسی نے باریک
سلائیاں گیلی گیلی مٹی پر ہلکے ہلکے پھیری ہوں۔ جس سے گیلی مٹی پر باریک
ٹیڑھی ٹیڑھی سی لکیریں پڑ گئی ہوں۔ دوسرے روز آ کر وہ غور سے ان لکیروں
کو دیکھتی۔ گھنٹوں سنجیدگی سے جیسے کسی نے جلدی میں کچھ لکھ دیا ہو۔ اور
بہت کوشش کرنے کے باوجود نہ پڑھا جاتا ہو۔ وہ غور سے ان لکیروں
کی گہرائیوں میں نہ جانے کیا ڈھونڈتی۔ دیکھتے دیکھتے وہ مسکرا دیتی اس کا سفید

چہرہ سرخ پڑ جاتا۔ پیلی پیلی سی ہتھیلی پھیلا کر لمبی لمبی کانپتی ہوئی انگلیوں سے سوکھی ہوئی ننھی ننھی مٹی کی گول گول گولیاں سی آہستہ آہستہ اٹھا کر رکھتی۔ آنکھیں خوشی سے چمکنے لگتیں۔ وہ بھاگ جاتی۔ قہقہے لگاتی ہوئی پاگلوں کی طرح۔

نرم نرم قالین پر مٹی میں بھرے ہوئے پیروں سمیت، وہ اخبار پر جھکے ہوئے سفید بالوں سے ڈھکے ہوئے سر کو اپنے مٹی میں بھرے ہوئے ہاتھوں سے دور سے اونچا کرتی اور پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتی ...... ہاہا ...... ہاہا ـــــ آج پھر مجھے سلیم بیٹے کی قبر پر سے اس کے کھیلنے کی گولیاں ملیں ـــــ وہ دیوانہ وار ننھی مٹی کی گولیوں کو چومتی ـــــ میرا لال، میرا سلیم ان گولیوں سے کھیلا کرتا تھا۔ ہاہا .... دیکھیں گولیاں۔ وہ بری طرح قہقہہ لگاتی ہوئی کمرے سے بھاگ جاتی ـــــ سفید سر دروازے کی طرف مڑ جاتا۔ لرزتی ہوئی آواز کمرے میں گونجنے لگتی ـــــ غریب بٹیا کی ـــــ پاگلوں سے بدتر حالت ہوگئی ـــــ کیچوے کی کھائی ہوئی مٹی جو گھانس میں گولیوں کی صورت میں پڑی رہتی ہیں اٹھا لاتی ـــــ اے خدا رحم کر۔ میری بٹیا پر۔ کس منحوس گھڑی میں میں نے بٹیا کا بیاہ کیا تھا

شادی کے تین مہینے بعد غریب کا سہاگ اجڑ گیا ——— پھر وہ معصوم ننھا سا سلیم ہوا جس سے یہ اپنا غم بھول گئی ——— آہ! اے قدرت تیرے کیا ہاتھ آیا ——— تو نے وہ بھی چھین لیا ——— غریب بٹیا اب مٹی کی گولیوں سے تسلی دیتی ہے اپنے دکھے ہوئے دل کو ——— اوہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مٹی کی گولیاں ———

تاروں کی چھیّائیں

ہائے رے رخشی یہ ہلکی ہلکی اداس سی چاندنی اور یہ دھندلا سا چاند..
.... یہ سرد سرد ہوائیں۔ جیسے سسکیاں بھرتی ہوئی ہمارے قریب سے
بچکر نکل جانا چاہتی ہوں۔ ہائے رخشی! میں کیا کروں۔ کیا زندگی ہے۔ یہ
کیسے دن آئے ہیں جو کاٹے نہیں کٹتے —— رخشی! میری پیاری رخشی!
سچ بتاؤ کیا تم بھی ایسی ہی بے چینی محسوس کرتی ہو —— نہیں رخشی! میری
جان سے زیادہ عزیز رخشی، تم آج اتنی بے چین کیوں ہو۔ بے چین تو میں
بھی نہیں۔ مگر نہ جانے اتنی شدت سے .... میرے جذبات مجھے کبھی
کیوں نہیں ٹوٹ پا دیتے۔ تمہارا قصور نہیں میری پیاری رخشی۔ بھولی سی
معصوم رخشی۔ یہ صرف تمہارے تصورات نے تمہیں تباہ کر دیا ورنہ

رہے ہیں تم خدا کے لئے اپنے آپ کو سنبھالو۔ میری رضی ——— تم غلط راستے پر چل نکلی ہو ——— یہ مجھے معلوم ہے جب تم کو معلوم ہوگا ——— کہ تم اپنی زندگی کی منزل کو اب تک نہ پا سکی ہو ——— ابھی تک بھٹک رہی ہو۔ ایسے راستے پر سرگرداں ہو جہاں سے تم ناامید لوٹو گی ——— تب ——— آہ میری رضی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خدایا وہ وقت مجھے نہ دکھانا تمہارا نازک سا تڑپتا ہوا بے چین دل۔ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگا اور پھر شاید میری معصوم رضی مجھے ڈر ہے کہ تم اپنا پیمانۂ صبر چھلکا نہ دو۔ ——— اور رسوا نہ ہو جاؤ۔ ۔ ۔ ہائے پروردگار۔ ۔ ۔ پھر شاید میں ۔ ۔ ۔ میں اپنی حسین تخیلات کی ملکہ کو دیکھ بھی نہ سکوں ان حسین سیاہ آنکھوں کے چمکیلے پانی میں تڑپتی ہوئی آرزوؤں کو میرے آنسو کبھی بھی ٹھنڈا نہ کر سکیں گے ——— خدا کے لئے رضی تم ہوش میں آؤ۔ جانتی ہو تم صرف غلط فہمی میں حسین خواب دیکھ رہی ہو۔ اور جب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب تم پر حقیقت کا انکشاف ہوگا ——— تب تمہارا رنگین خواب کب کا تمہارا ساتھ چھوڑ چکا ہوگا ——— میری رضی میں تم کو اتنا عزیز سمجھتی ہوں جتنا ایک سچا ہمدرد ایک حقیقی بہن ایک حقیقی بہن سے ——— محبت کرے ——— راحیل کو تم اب تک غلط سمجھ رہی ہو ——— مانا کہ وہ میرا بھائی ہے۔ خوبصورت ہے۔ گریجویٹ ہے۔ ہر طرح سے قابل ہے مگر رضی

جب میں اس کے مقابلہ میں تم کو دیکھتی ہوں تو دل ایک دم سے دھک سے رہ جاتا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا چھا جاتا ہے تم ایک نرم و نازک دل کی مالک پرکشش چہرہ کی مالکہ۔ تمہارے حلقے میں مسکراہٹ نے جنم لیا۔ قہقہوں سے کھیلی ہو۔ آزادی کے جھولے میں جھول رہی ہو۔ اور شعر و ادب کی ہمجولی ——— تم تباہ ہو جاؤ گی۔ اپنی آزادی کا گلا تم خود غلط فہمی میں ایک دن گھونٹ لو گی اور پھر یہ شگفتہ کلی چند دن کی بہار کے بعد کھلنے سے پہلے مرجھا جائے گی ——— اس وقت کی حالت مجھ سے نہیں دیکھی جائے گی۔ راحیل کو تم سے ذرا بھی دلچسپی نہیں ——— رضی میں تمہاری بھلائی کے لئے کہہ رہی ہوں۔ میں انہیں اور اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتی جب تم میری بھابی بنتیں مگر رضی میں تم کو قربانی کا بکرا نہیں بنا سکتی مجھے تم سے ہمدردی ہے اور افسوس ہے اپنے خوبصورت بھائی پر۔ کاش وہ اپنے خیالات تبدیل کر سکتا ——— ایم اے کرنے پر بھی وہی ایک زمینداروں جیسے دماغ کا مالک پرانی لکیر کا فقیر ——— کتنا مغرور قسم کا انسان ——— اس کے مقابلے میں تم جیسی ہنس مکھ آزاد خیال معصوم رضیہ ہائے راحیل میرا حقیقی بھائی ہے۔ میرا خون ہے ——— مگر جانتی ہو رضی بس ——— اس کو تم پر سے قربان کر دوں ——— ہائے رضی ایسا نہ ہو ——— خدا کے لئے میرا دل آج نہ جانے کیوں بے چین ہے ———

چلو اندر چلیں تم جانتی ہو چاندنی رات میں پاگل ہو جاتی ہوں۔ نہ جانے کیوں جی چاہتا ہے کہ روتی ہی جاؤں۔ خوب جی بھر کے روؤں ـــــــ

رخشندہ اور رضیہ کی آواز اب اور بھی دھیمی ہوتی گئی ـــــــ راحیل نے کرسی پر سے اُٹھ کر تاروں پر چڑھی ہوئی عشق پیچاں کی بیلوں میں سے ـــــــ دھڑکتے ہوئے دل سے پتوں کو آہستہ آہستہ ہٹا کر دیکھنا شروع کیا ـــــــ

اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ ٹانگیں بھی لرز کر رہ گئیں ـــــــ ماتھے پر پسینہ کے قطرے بہہ رہے تھے ـــــــ اس نے دیکھا ہلکی ہلکی زردسی اُداس چاندنی میں رضیہ کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا ـــــــ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جن میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ پریشان سنہری بال، سیاہ باریک دوپٹہ میں سے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے ـــــــ اُسے آج اپنی عمر میں پہلی بار عورت اتنی خوبصورت نظر آئی۔ رضیہ کا اداس سا چہرہ سیاہ شریر سی آنکھیں آج نہ جانے اتنی غمگین کیوں تھی۔ وہ رخشندہ کی باہوں میں باہیں ڈالے ٹہل رہی تھی۔ ہری ہری نرم گھانس پر اس کے گورے گورے نازک سے پیر جو چپلوں میں سے صاف نظر آ رہے تھے۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اس کے دھڑکتے ہوئے دل کو کچل رہے ہوں ـــــــ اتنی باتیں نہ جانے وہ کیوں جب سے سن رہا تھا ـــــــ

اس نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ رخشندہ کی ہزاروں سہیلیاں آتی تھیں مگر اس نے کبھی بھی کسی سے دلچسپی نہیں لی مگر —— رضیہ ——
رضیہ —— رضیہ اب رخشندہ کے شانے پر سر رکھے ہوئے اداس اداس نظروں سے پھیکے پھیکے سے دھندلے چاند کو دیکھ رہی تھی —— دھیمی سی آواز پھر بلند ہونی شروع ہو گئی —— رضیہ آہستہ درد بھری آواز میں گنگنا رہی تھی ؎

ارمانوں کی بستی کو ہم آگ لگا بیٹھے — اے دل تری دنیا کو ہم آپ لٹا بیٹھے
پانی میں بہا دیں گے گھڑیاں تری فرقت کی — ہم آنکھوں کے پردوں میں ساون کو چھپا بیٹھے

سیاہ چمکیلی سی بے چین آنکھوں میں تڑکے ہوئے آنسو بہہ نکلے ——
اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں بندھ گئیں۔ گلابی گلابی ہونٹ کانپنے لگے
وہ اک دم سیدھا کھڑا ہو گیا۔ جھٹکے جھٹکے اس کی کمر دکھنے لگی تھی اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا سہمی سہمی نظروں سے ——

مگر —— کوٹھی میں کوئی بھی نہ تھا۔ سب بچے اور گھر کے سب بڑے پاس ہی کوٹھی میں دعوت میں گئے ہوئے تھے۔ آج اس کا کلب میں بھی دل نہیں لگا تھا۔ اس نے وہ جلدی ہی واپس آ گیا تھا مگر کوٹھی میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ ٹہلتا ٹہلتا کوٹھی کے پچھلے کمپاؤنڈ کی طرف نکل گیا —— (جو شاید ع H) کے نیچے باتوں کی آوازیں جیسے اسے کھینچ رہی تھیں۔ وہ

جھاڑیوں میں تاروں پر چڑھی ہوئی بیلوں کو آہستہ آہستہ ہٹا کر دیکھ رہا تھا ــــ وہ کانپ رہا تھا ــــ جیسے پہلی دفعہ چوری کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اور قدم نہ اٹھ رہے ہوں۔ اس کو اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز بھی آج بہت زور سے معلوم ہو رہی تھی۔ اُسے ڈر تھا کوئی سن نہ لے تھوڑی سی جھاڑیاں ہلیں وہ خوف سے کانپنے لگا ــــ مگر نہ جانے کیا چیز تھی۔ کوٹھی میں آدمی کوئی بھی نہ تھا۔ اس کی انگلیاں خود بخود عشق پیچاں کی بیل کے پتوں سے کھیلنے لگیں۔ رضیہ اور رخشندہ اب ایک دم اس کے سامنے بینچ پر بیٹھی تھیں۔ کالے باریک ریشم کے دوپٹے میں لپٹا ہوا اس کا مرجھایا ہوا خوبصورت معصوم سا چہرہ بھیگی ہوئی چمکیلی پلکوں میں آنسو ٹپک رہے تھے ــــ اس کے پتلے پتلے ہونٹ کپکپاتے۔ اور اس نے اپنے گورے گورے ہاتھوں میں رخشندہ کے گول گول ہاتھ زور سے دبائے ہوئے نیچی نظریں کئے ہوئے کہنا شروع کیا۔ رخشی پیاری تم کتنی بھولی ہو۔ بالکل اپنے راحیل کی طرح۔ وہ بھی سب کچھ جانتے ہوئے بنتے ہیں۔ دوسروں کو تڑپانا ان کا شیوہ ہے آخر اگر وہ ــــ انہیں اگر کچھ بھی خیال نہیں تو رخشی تم بتاؤ ایک ایسا شخص بقول تمہارے مغرور قسم کا لڑکا جو کبھی کسی سے زیادہ بات نہ کرتا ہو اور ...... وہ پھر اس روز رات کو جب فرزانہ آپا کی سہیلی آئی تھی ڈنر پر تم نے پھر بھی اندازہ کیا تھا۔ اس روز رات کو ــــ

یاد ہے میں کبھی نہیں بھولوں گی رخشی جب سب لڑکیاں کاریں بھر گئی تھیں پچھلی طرف اور ایک میں رہ گئی تھی ۔ اس روز ڈرائیور کو بخار ہو گیا تھا۔ تب فرزانہ آپا خوشامد کرتی رہیں راحیل بھیا کی کہ میری سہیلی کو چھوڑ آؤ تو وہ ــــــ جانتی ہو انہوں نے کس نفرت سے تیوری پر بل ڈال کر کہا تھا۔ جی نہیں مجھے معاف رکھیں اپنی سہیلیوں سے آپا جان۔ پاپا جان چھوڑ آئیں گے۔ مگر جب تم نے کہا کہ رضیہ کو جلدی جانا ہے تو وہ ــــــ کیسے سٹ پٹائے تھے اور ان کے سفید سفید چہرے کا رنگ کتنا سرخ ہو گیا تھا۔ اس وقت میری جان نکل گئی تھی کیونکہ فرزانہ آپا مسکرا کر کبھی راحیل بھیا کی طرف دیکھ رہی تھیں اور کبھی میری طرف۔ انہوں نے کس بیوقوفی سے کہا تھا اچھا لاؤ موٹر کی چابی۔ مجھے اس وقت ایسا محسوس ہوا تھا رخشی جیسے مجھے کسی نے ایک ہاتھ میں اٹھا کر آسمانی فضاؤں میں چھوڑ دیا ہو۔ جہاں میں اڑتی ہی چلی جا رہی تھی۔ اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں بہتی بہی جا رہی تھی۔ اور پھر شرمندگی مٹانے کو فرزانہ آپا کو منہ چڑا کر کہا تھا۔ آپا سچ کہہ رہا ہوں تمہاری آنسوؤں سے لبریز آنکھوں نے مجبور کیا ہے۔ ورنہ کبھی نہ جاتا۔ جہاں کار کھڑی تھی۔ اس روز بہت اندھیرا تھا نہ جانے انہیں نے میری کالی ساڑھی کیسے پہچان لی تھی جب ساری لڑکیاں بیٹھ گئیں تو میں اور جولی رہ گئے۔ جولی کو میں نے آگے ان کے

پاس بیٹھنے کا چپکے سے اشارہ کیا اور میں روحہ کی گود میں پچھلی طرف بیٹھنے
والی تھی جو انہوں نے مجھے پکارا۔ آہ رخشی اپنی اتنی ملاقاتوں میں میں نے
پہلی بار ان کے منہ سے اپنا نام سنا۔ میں بیان نہیں کر سکتی۔ میری کیا
حالت ہوئی۔ اس اندھیرے میں بھی ان کا چہرہ چمک رہا تھا۔ اور وہ
سیاہ چمکیلی آنکھیں شاید میری پریشانی کا اندازہ کر رہی تھیں آخر انہوں نے
تیوری پر بل ڈال کر دوبارہ آواز دی۔ مگر آہستہ سے۔ تم اس طرف آجاؤ
اور یہ صاحبہ بھی کیونکہ پیچھے جگہ نہیں تھی ——— میں اپنے بوجھل جسم کو بمشکل
اٹھاتی ہوئی باہر تو آئی۔ نہ جانے اتنا بوجھ کیوں ہو گیا تھا۔ اور کار کے دروازے
کے پاس آکر رک گئی جوگی کو میں نے آہستہ سے کہا کہ وہ ان کی طرف بیٹھ جائے
حالانکہ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر انہوں نے نہایت ہی غصہ سے حکم
دیتے ہوئے کہا۔ دیر ہو رہی ہے کس قدر سست ہو جلدی ادھر بیٹھو میں
کچھ سہم سی گئی اور ان کے قریب بیٹھ گئی۔ کئی دفعہ آپ کا ہاتھ میرے جسم سے
ٹکرایا۔ بریک لگاتے وقت سیدھی سڑک تھی نہ جانے کیوں۔ او بھولی
رخشی یہ سب غلط فہمی ہے۔ یہ سب قصور تمہارے اس دماغ کا جو تم
ایک معمولی سی بات کا سوچتے سوچتے ایک رومانی پہلو نکال لیتی ہو۔ وہ تو
بے حس سا لڑکا ہے مغرور۔ اس میں تجھے کوئی لگاوٹ نظر نہیں آئی، اور
نہیں رخشی مجھے محسوس ہوا۔ پاگل رخشی یہ صرف تمہارے دماغ کا خلل ہے

ورنہ اس شخص سے اور کسی کو ہمدردی کی اُمید ——— جانتی ہو گھر بھر
میں کوئی چھوٹا بچہ نہیں فرزانہ آپا کی بچی صبیحہ کتنی پیاری ہے ———
سارا گھر بھر اسے کتنا پیار کرتا ہے۔ مگر چار مہینے اسے آئی کو ہوئے۔
مجال ہے جو کبھی اس سے بات تک کی ہو یا کوئی چیز اسے بازار سے
لا کر دی ہو۔ گھر کی کسی بات میں کوئی انٹرسٹ نہیں! ہاں جب کبھی میں
اور فرخندہ کہیں کسی سہیلی سے ملنے جائیں تو چپکے سے پاپا جان کو کہہ دیتا ہے
آپ نے لڑکیوں کو بڑی آزادی دے رکھی ہے۔ حالانکہ خود کالج میں
لڑکیوں کے ساتھ پڑھتا ہے۔ مگر رخشی ——— وہ اتنے strict ہیں تو
مجھ سے کیوں کبھی کبھار بات کر لیتے ہیں۔ مگر جب کوئی نہیں ہوتا یہ عجیب
عادت ہے ان کی یا خود شرماتے ہیں۔ یا پھر تم سے ڈرتے ہیں کیوں
ٹھیک ہے نا۔ جب ان کو لڑکیوں سے نفرت ہے تو وہ ——— رخشی
پھر مجھ سے کیوں بولتے ہیں انہیں معلوم ہے میں نے ڈانس کالج جوئین
کر رکھا ہے اس میں لڑکے لڑکیاں اکٹھے سیکھتے ہیں۔ ان کے نقطہ نظر
سے میں پھر بہت ہی بُرے کیریکٹر کی لڑکی ہوں گی مگر پھر بھی وہ مجھ سے
بولتے ہیں۔ یاد ہے جب ان کے سر میں اس روز کتنا درد تھا۔ صبح سے شام
تک وہ اپنے کمرے میں پڑے رہے کھانا بھی نہیں کھایا تھا ——— رخشی
پیاری تم نے اس روز کچھ اندازہ نہیں لگایا ——— جب میں تم کو لے کر

ان کے کمرے میں گئی تھی۔ بہانے سے اور تم نے ان کی میز پر سے فلم انڈیا اور الیسٹرن ویکلی اٹھاتے ہوئے کہا تھا۔ لو رضی یہ تو بل گئے کاروان نہ جانے کہاں ہے اور تم میز پر اور کمرے میں یونہی ڈھونڈ رہی تھیں حالانکہ ہم خود ڈرائنگ روم میں صوفے پر رکھ کر آئے تھے پڑھتے پڑھتے اور میں نے ڈرتے ڈرتے ان کی طرف دیکھا تھا وہ سر سے رومال باندھے سرہانے کی کھڑکی میں سے دور آسمانی فضاؤں میں کیا ڈھونڈ رہے تھے۔ ان کا رنگ کس قدر سرخ ہو گیا تھا۔ اور میں نے پھر ڈرتے ڈرتے مری ہوئی آواز میں پوچھا تھا اب آپ کے سر میں درد کم ہوا کہ ویسا ہی ہے۔ اور انہوں نے گھبرا کر اٹھتے ہوئے کہا تھا۔ نہیں تو ——— اور جیسے ان کی سیاہ سی اداس سی آنکھیں کچھ ایسے انداز سے کہہ رہی تھیں ——— تمہیں کیا' اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا بےچین دل تڑپتا ہوا باہر کھنچا چلا آ رہا ہو اور سیاہ نگاہوں کے چمکیلے پن میں مجھ کو چھپا لے گا پھر انہوں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے گھبراتے ہوئے پوچھا تھا کیوں آپ بمبئی نہیں جا رہی ہیں۔ سنا تھا' میں حیران رہ گئی تھی۔ اور جھجکتے ہوئے میں نے پوچھا تھا۔ آپ کو کیسے معلوم کہ میں بمبئی جا رہی ہوں۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ ہمیں بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ آخر پھر بھی میں نے بھی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ وہ کتنے بے تکلف ہو گئے تھے ——— اور میں بھی ۰۰۰۰

لیکن ساتھ کے کمرے میں پاپا جان کے بولنے کی آواز آرہی تھی - وہ کتنے گھبرا گئے تھے اور اس وقت تو سچ مچ ہمارے بھی ہاتھ پیر پھول گئے تھے، اور انہوں نے گھبراہٹ میں اٹھتے ہوئے باغیچے کی طرف کا دروازہ کھولدیا تھا ـــــ اور تم مجھے گھسیٹتی ہوئی ایک ایک سیڑھی کے بجائے دو دو سیڑھیاں طے کر رہی تھیں ـــــ ہم بھاگتے ہوئے اسی چھوٹے انار کے پیڑ کے نیچے پہنچ گئے تھے اور میں نہ جانے کون کونسے جذبے سے مغلوب ہو کر تم سے کس زور سے لپٹ گئی تھی ـــــ اور تم بری طرح ہنس رہی تھیں ـــــ یاد ہے، خشی' ـــــ وہ مسکرا رہی تھی، ایسی مسکراہٹ جس میں ہزاروں یادیں دبی ہوئی تھیں ـــــ وہ پھیکے پھیکے داغدار سے چاند کو میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھ رہی تھی - گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی ـــــ وہ ہلکی ہلکی اداس سے چاندنی میں کھو گئی تھی ـــــ گذشتہ یادوں میں اس کے لطیف تصورات سے اس کے سفید چہرہ پر تھوڑی تھوڑی سرخی دوڑ گئی تھی - وہ نڈھال سی پنچ کے شانے پر اپنی نرم نرم سفید باہیں پھیلائے ہوئے لیٹ سی گئی تھی ـــ سیاہ سیمیں دوپٹہ اب سینے پر پھیل رہا تھا - کھلے ہوئے پریشان بال ہوا میں لہرا رہے تھے ـــــ عورت کتنی حسین ہوتی ہے وہ آج متحیر سا ہو گیا تھا - ایسا معلوم ہو رہا تھا - جیسے ہری گھانس پر جہاں چاروں طرف سیاہی کُل

درخت ہی درخت تھے۔ جن کے پتوں میں سے اداس پھیکی پھیکی چاندنی چھن چھن کر رضیہ کے اوپر پڑ رہی تھی ـــــ ستاروں کی چھاؤں میں ایک سنسان سے ہرے بھرے پرسکون سے کنج میں بنچ پر رضیہ ایسی بیٹھی تھی جیسے آسمانی فضاؤں سے کوئی حور معصوم سی گھبرائی ہوئی بھولے سے اس پھیکی پھیکی روشنی میں۔ اس پرسکون کنج میں ذرا یونہی سی اتری چلی آئی ہو ـــــ اس کی چمکتی ہوئی سفید سیاہ چمکتے بالوں میں گھری ہوئی پیشانی پر پانی کے قطرے چمک رہے تھے ـــــ جھاڑیاں سہم کر ایک دوسرے سے لپٹ گئیں ـــــ سَر سے کوئی کالی سی چمکیلی چیز نہ جانے جھاڑیوں میں ہوتی ہوئی بنچ کے پیچھے رات کی رانی کی پودوں میں غائب ہوگئی ـــــ وہ نجانے کیوں کانپ گیا۔ اُسے یاد آیا۔ کل ٹھیک اسی وقت شیر سنگھ مالی نے جب وہ گشت کرتا ہوا گذرا تھا تو رات کی رانی کی جھاڑیوں کے پاس پھولوں کے گچھے میں لپٹا ہوا سیاہ سانپ دیکھا تھا جسے اس نے لٹھ سے کس ہوشیاری سے مارا تھا۔ آج پھر اس طرف سیاہ سی کوئی چیز گئی ہے۔ اور یہ بیوقوف سی لڑکیاں ساری کوٹھی چھوڑ کر اس وقت یہاں آکر بیٹھی ہیں۔ وہ بڑبڑایا وہ بھی تو خود بیوقوف ہے اتنی دیر سے Hegde کے پیچھے کھڑا جھانک رہا تھا۔ وہ گھبرایا جلدی کچھ انتظام کرنا چاہئے۔ اور

بھاگتا ہوا شیر سنگھ کو لٹھ سمیت لے آیا۔ ابھی وہ گیٹ تک پہنچا بھی نہ تھا جو دو چیخوں کی آواز نے اسے اور بھی تیز کر دیا —— گھستے ہی جیسے اس کے سارے جسم کی جان ہی تو نکل گئی۔ رخشندہ بد حواس بینچ سے کچھ دور پر کھڑی ہوئی تھی۔ خوف سے رنگ زرد پڑ گیا تھا ”اوہ راحیل بھیا —— خدا کے لئے رضیہ کی جان بچائیے۔ اور شیر سنگھ کچھ کر گردن میں بری طرح سے لپٹ گیا ہے —— ہائے میری رضی ——“

شیر سنگھ لٹھ پھینک کر ایک دم بھاگ گیا۔ راحیل بھیا کچھ کرتے —— میں اور رضی اس بینچ پر بیٹھے تھے کئی دفعہ رات کی رانی کے پودوں میں کوئی چیز سرسراتی رہی۔ ہمیں خیال بھی نہ تھا۔ رضی کے بال کھلے ہوئے بینچ کے پیچھے لٹک رہے تھے۔ ایک دفعہ ہی اس کے شانے پر کوئی چیز سرسرائی اس نے جو مڑ کر دیکھا تو سانپ تھا۔ اور اب تو گلے میں اچھی طرح سے لپٹ چکا ہے۔ راحیل بھائی خدا کے لئے کچھ کیجئے ہائے لیتا یہ سنگدلی اچھی نہیں۔ میری معصوم رضی —— رضی کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا سیاہ بالوں میں گھری ہوئی سفید چمکیلی ..... پیشانی کو سیاہ مست چمکیلا سانپ چومنے کی کوشش کر رہا تھا ——

چاندنی رات میں تاروں کی چھیا میں زندگی اور موت آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ ایک دفعہ ہی سنسان فضا میں دور کوئی بین بجاتا ہوا آ رہا تھا۔ بین کی

، واز قریب ہوتی جارہی تھی رخشندہ کی آنکھیں چمکنے لگی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا دھڑکتا ہوا دل تھامنے کی کوشش کی اور چمکیلا کالا پھن کالے بالوں میں لپٹ کر اور بھی جھومنے لگا ــــــ وہ ایک دم سرد پڑ گیا تھا آج وہ سچے دل سے گڑگڑا کر خدا سے دعا مانگ رہا تھا آج پہلی دفعہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تھے۔ وہ تڑپ رہا تھا اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی زندگی کے لمحے کچھ دیر میں ختم ہونے والے ہیں۔ اس کا گلا گھٹتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ دعا مانگ رہا تھا اے زہریلے سانپ تو اپنی ہی ہم جنس کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔ اس نازک گردن کو چھوڑ دے جس کے اندر محبت کا رس ہی رس ہے۔ جس میں سریلے نغمے پنہاں ہیں۔ چھوڑ دے میری زندگی ختم ہو جائے گی۔ آ اور مجھے سزا دے کہ میں نے ایک معصوم دل کو پہچانا نہیں اب ظلم نکر وہ آنکھیں بند کئے کھڑا تھا ــــــ کئی دفعہ اس نے سانپ کو پکڑنا چاہا تھا۔ مگر پھر رک گیا۔ . . . . . . وہ ڈرا نہیں سانپ کو پکڑنے سے اُسے ڈر تھا کہ جس چمکتی ہوئی پیشانی کو وہ چومنا چاہتا ہے۔ کہیں مجھے بڑھتے ہوئے حسد سے وہ چوم نہ لے۔ اور سیاہ چمکیلی نوکدار پلکیں سیاہ آنکھوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نہ ڈھک لیں آہ۔ وہ اس خیال سے بے چین ہو جاتا مگر وہ ہوش میں آ گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ شیر سنگھ بین بجاتے ہوئے رخشندہ

کے سامنے بیٹھ گیا وہ ایسے دردناک نغمے تھے کہ رضیہ کے گلے کی گرفت ڈھیلی پڑتی گئی اور اس کے شانے پر سے ہوتا ہوا وہ سانپ تیزی سے شیر سنگھ کی طرف لپکا ——— اور اس کے بالکل قریب مست ہو کر جھومنے لگا۔ راحیل میں اب جان آ گئی تھی اور اس نے چپکے سے شیر سنگھ کے ڈنڈے کو اٹھا کر مست جھومتے ہوئے سانپ پر مارا۔ ڈنڈا کمر پر لگا تھا انتقام کی آگ بھڑک اٹھی تھی مگر کمر کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی وہ تڑپ کر شیر سنگھ کی طرف لپکا مگر شیر سنگھ اچھل کر اب اس کا سر پتھر سے کچل رہا تھا ——— اس نے مردہ زخمی سانپ کو اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھا سرکار یہ سانپن تھی جس کا سانپ کل میں نے مارا تھا۔ اور بڑی خیر ہو گئی اس نے شرمندہ نظروں سے رخشی کی طرف دیکھا اور نہ جانے کتنی مدت بعد اس کے منہ سے لفظ نکلے۔ رخشی بہن پانی جلدی سے لاؤ رضی ابھی تک بے ہوش ہے۔ جلدی کرو۔ اور شیر سنگھ کو کچھ دوا لانے کو کہا جب رخشی پانی کا جگ لئے بھاگتی ہوئی آئی تو اس نے دیکھا وہ ایک دم ٹھٹک گئی۔ اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی ——— پھیکی پھیکی چاندنی میں تاروں کی چھپتا ہیں۔

راحیل کی رانوں پر رضیہ کا سر رکھا ہوا تھا۔ اور وہ رومال سے اس کے چہرے کا پسینہ پونچھ رہا تھا۔ اس کے سیاہ بکھرے

ہوئے بالوں میں اس کی انگلیاں تیر رہی تھیں ــــــــــ . . . .
رضیہ کے مرجھائے ہوئے چہرے پر ایک طنز یہ مسکراہٹ پھیلی
ہوئی تھی۔ سنسان فضا میں ایک لرزتی ہوئی آواز گونجی۔ میری رضی
آنکھیں کھولو، رضی، اور وہ اس کے چہرہ پر جھک گیا ــــــــــ وہ اس
وقت کتنی معصوم نظر آرہی تھی۔ نرم نرم گھاس پر پھیکی پھیکی روشنی میں
تاروں کی چھیّا میں دو سائے تھرتھرا رہے تھے ؛

زندگی کی پہلی بھول

آج ـــــ میں مدت کے بعد ـــــ اپنے پرانے مکان
میں واپس آیا ـــــ میری بصارت مجھے دھوکا تو نہیں دے رہی
تھی ـــــ کیا واقعی ـــــ تم میرے کوئی نہیں ـــــ آہ
ـــــ میں نے دھوکا کھایا ـــــ آج جمعرات تھی ـــــ
میں بےچین تھا ـــــ مدتیں گذریں ـــــ تم کو دیکھا نہیں تھا تم
بھول گئے ـــــ شاید تم بیمار تھے ـــــ میری روح بےقرار
ہوگئی ـــــ مدتیں ہوئیں مجھے تم سے بچھڑے ہوئے ـــــ میرے
لال ـــــ کیا تمہاری محبت کی آخرت ـــــ مٹی میں ملا دینے
تک تھی ـــــ مگر ـــــ میں بےچین ہوں، میری روح کو ابتک

سکون نہیں ـــــ ہاں ـــــ تمہارے کراہنے کی آواز مجھے یہاں سنائی دی ـــــ جہاں تمہاری جیسی ہستی کا گذر تک نہیں ـــــ جہاں ہیں اور فطرت کی صنعت کاری ـــــ وہ حسین و معصوم نورانی چہرے ـــــ اکثر میری دل جوئی میں مصروف رہتے ہیں ـــــ آج میرا دل بے چین تھا ـــــ میرے خطاوار کانوں نے تمہاری حسرت میں ڈوبی ہوئی آواز اس مقدس دنیا میں بھی سن لی ـــ میری روح بے چین ہو گئی ـــــ وہ نغمے جو مجھے ابھی مدہوش بنا رہے تھے ـــــ تمہاری درد سے کراہتی ہوئی آواز نے مجھے بیدار کر دیا ـــــ میں تڑپ اٹھا ـــــ آہ ـــــ میرے دکھوں کا سکھ ـــــ میرا لال ـــــ میری روح تجھ میں سما جانا چاہتی تھی ـــــ تیری تکلیف مجھے محسوس ہو رہی تھی ـــــ تری آواز نے مجھے بیقرار کر دیا ـــ

آبا! میرے پیارے باپ ـــــ تو کہاں ہے ـــــ آہ ـــ

اے میرے معبود ـــــ تجھے کیا ملا ـــــ میرے ہاتھ بے اختیار رب عالی کے حضور میں اٹھے ـــــ میرے لال کو ـــــ ہری ـــ اب زیادہ تکلیف نہ دے ـــــ شاید قدرت مجھے تیری محبت دکھانا چاہتی تھی ـــــ مجھ کو قدرے سکون تھا ـــــ رات بہت گذر چکی تھی ـــــ تو آرام کی نیند سو رہا تھا سارے گھر میں خاموشی

تھی ——— سب میٹھی نیند میں مدہوش تھے ——— تیرے پلنگ کے نیچے میری دنیا کی رفیق ——— حقیقی لفظوں میں تیری ماں ——— سو رہی تھی ——— مجھے یاد آیا ——— میں بھی کبھی ایسی ہی محبت سے مغلوب ہو کر تیری بیماری میں اکثر راتیں کاٹا کرتا تھا ——— تم اب ——— اپنی تصویر میں نئے نئے رنگ بھرنے میں مشغول تھے۔

سچ بتا ——— کیا تو بھی مجھے یاد کرتا ہے ——— ہاں ——— آج مقدس دن تھا ——— میں اپنے گھر میں آیا ——— جہاں آخری دفعہ تم نے میرا منہ دیکھا تھا ——— اور پھر کبھی خبر نہ لی ——— میں چیخا ہزاروں واسطے دیئے ——— مگر تم ——— تم کو کیا ہو گیا تھا تم میری ذرا سی تکلیف سے بے چین ہو جاتے تھے ——— کیا وہ سب مصنوعی اداکاری تھی ——— نہیں ——— نہیں، یہ میری بھول تھی ——— یہ تو دنیا کا پہلا سبق تھا ——— جو شاید میں نے بھی سیکھنے کی کوشش کی تھی ———

ہاں ——— قدرت نے مجھے تمہاری محبت کی سچی تصویر دکھادی میرے ٹوٹے ہوئے مکان کے آس پاس والے مکان جن کے مالک تم جیسے دکھاوٹ کے مالک نہ تھے ——— میں نے دیکھا ——— کچھ لوگ آئے ——— شام کا دھندلکا چھا چکا تھا ——— نصیبہ والوں

کے نشان سحد کو مہکتے ہوئے گلاب کے پھولوں نے کھلتی ہوئی چنبیلی کی کلیوں نے چھپانے کی کوشش کی تھی ـــــ ہوا تیزی سے چل رہی تھی ـــــ جلتی ہوئی شمع نہ جانے کتنے ارمانوں سے کسی یتیم نے ـــــ کسی بچھڑے ہوئے بھائی ـــــ بہن نے ـــــ کسی لاوارث بیوی نے دھڑکتے ہوئے دل سے جلائی ہوگی ـــــ مگر ـــــ آہ ظالم ہوا کے جھونکوں نے ـــــ چند منٹ بھی تو مزار پر روشنی نہ ہونے دی ؎

پسِ مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
اُسے آہ دامنِ باد نے سرِ شام ہی سے بجھا دیا

اور ایک طویل آہ کے ساتھ ـــــ شمع نے بھی سیاہ چادر اوڑھ لی ـــــ اور ـــــ اپنے پرستاروں کو بے بسی دے کے کفن پروانوں کو ـــــ جنہوں نے ـــــ محبت کی مثال قائم کر دی تھی ـــــ خیر ـــــ ؎

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

مگر ـــــ میں اس سے بھی محروم تھا ـــــ میری بے نشان قبر کو دو پھول بھی نصیب نہ تھے ـــــ کہاں شمع و پروانہ کی آخری ملاقات میں اب بھی بے چین تھا ـــــ میری روح بے قرار تھی ـــــ

مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی ——— کیا تم نے مجھے دھوکا تو نہیں دیا ——
میرے کان ——— یہ کیا سن رہے تھے ———

کمرے سے قہقہوں کی پیہم آوازیں آ رہی تھیں ——— میری رفیق
دنیا ——— میرے دکھوں کا سکھ ——— میری جان سے زیادہ
عزیز بیٹی ——— سب مجھے فراموش کر چکے تھے ——— میری روح
کانپ گئی ——— کیا دستور دنیا یہی ہے ——— میرا کوئی نہیں...
یہ اعمال کے کردار ———

قدرت میری بے بسی پر مسکرا رہی تھی ——— مجھے تم سب
سے نفرت ہے ——— ہر انسان اپنی اپنی عاقبت کا آپ
ذمہ دار ہے ——— میں بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا تھا ———

جب بیتے دن یاد آتے ہیں

نگری میری کب تک یونہی برباد رہے گی ——— دنیا ———
دنیا ہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی ——— نگری میری کب تک یونہی برباد رہے گی
——— تالیوں کی آواز سے کلاس روم گونج اٹھا ——— واہ ———
خدایا تم کتنا اچھا گاتی ہو ——— روحی ——— ہائے اللہ کاش کہ ہم بھی
ایسا گا سکتے ——— نجمہ۔ اقبال۔ عقیلہ۔ رفعت وغیرہ نے اپنے اپنے —
دوپٹوں کو ٹھیک کرتے ہوئے۔ اور ڈیسکوں پر اچھی طرح سے بیٹھتے ہوئے پوچھا
شروع کر دی ہائے روحی خدا کی قسم جب تم گاتی ہو تو یہی جی چاہتا ہے کہ ٹھنڈی ٹھنڈی
ہوا کے جھونکے کہیں اور لے جائیں اور دور تمہاری یہ درد بھری آواز سنائی دیتی
رہے۔ رفعت اپنی بڑی بڑی پرنم آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے شاعری فرما رہی

تھیں۔ مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ اُف رفعت کس قدر زور شور سے آپ شاعری فرمانے لگی ہیں خیر تو ہے۔ جانتی ہو شاعری جب دنیا کی ہر چیز میں نظر آتی ہے وہ کونسی اسٹیج ہوتی ہے۔ جانتی ہو رفعت، قدسیہ نے اپنی ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے سوال کیا اور رفعت کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ ہائے میرے اللہ تو نے ابھی سے ہماری معصوم رفعت کو یہ روگ لگا دیا۔ فہمیدہ وغیرہ اپنے گورے گورے

ہاتھ جوڑ کر مسکراتے ہوئے رفعت کے سامنے جھک گئی۔ اور قہقہوں سے ایک بار پھر ہماری کلاس گونج اٹھی شائد آپ سمجھ رہے ہوں کہ عجیب پڑھائی ہوتی تھی کہ گپ شپ ہی نظر آتی ہے۔ نہیں جناب خیر سے ہماری کلاس ٹیچر آج غائب تھی یعنی میرے خیال میں موسم اچھا تھا اور محترمہ کو شاید کسی نے مجبور کیا ہو کہ چلئے ذرا پکنک ہی پر آج چلیں کیوں۔ کتنا اچھا موسم ہے۔ اور پھر خیر سے وہ ہیں بھی من موہنی ہائے اللہ نیلی جارجٹ کی ساڑھی ہیں مسز شاغل کتنی خوبصورت لگتی ہیں گورا سرخ و سفید سا کتابی چہرہ گلابی گلابی پتلے پتلے ہونٹ سیاہ کرل بال اور چھوٹی چھوٹی لمبی پلکوں دار آنکھیں جو بے حد چمکیلی تھیں۔ لانبی سی دبلی پتلی اور ہائے رے جب وہ عنابی رنگ کا جارجٹ کا رومال سر پر باندھ کر موٹر ڈرائیو کرتی ہیں تو سچ کہتی ہوں کہ۔۔۔ ہم کو اتنی اچھی لگتی ہیں کہ ہم بہانے بہانے یہی منظر دیکھنے کے لئے ان کی کار تک رجسٹر اور کتابیں اٹھا کر لے جاتے تھے کہ یہی دفعہ ان کی آنکھیں ہائے

اللہ غضب کی خوبصورت لگتی تھیں تو پھر مسٹر شاغل اور ان کے بہت ہی گہرے دوستوں کا کیا حال ہوتا ہوگا ـــــــ ہاں تو وہ آج تو بہت ہی خوبصورت ساڑی پہن کر پکنک پر گئی ہوں گی۔ اور اپلیکیشن میں لکھ دیا کہ طبیعت خراب ہے میرا بے اختیار جی چاہا کہ گھر جا کر دیکھ کر آؤں اور جب وہ خوبصورت سی ساڑھی پہنے ہوئے مسٹر شاغل سمیت اور ان کے گہرے دوستوں کے ساتھ اٹھلاتی ہوئی گیٹ سے نکلیں تو میں بے اختیار ناچتے ہوئے ان کے آگے سے نکل جاؤں منہ چڑاتی ہوئی اور جب وہ حیرت سے مجھے دیکھیں تو میں انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے انہیں جتا دوں کہ عادت ہے تمہاری خراب۔ بُرا نہ مانو تو اور تیزی سے بھاگتی ہوئی اپنی منتظر ساتھیوں سے لپٹ جاؤں اور پھر وہ سب گھبراہٹ میں پوچھیں روحہ مسز شاغل گھر ہی تھیں کیا واقعی ان کی طبیعت خراب ہے۔ ہائے اللہ آج وہ کیوں نہیں آئیں۔ اور اسی قسم کے سوالات کی بوچھاڑ شروع ہو جائے۔ میں سب کو جلانے کے لئے چیخ چیخ کر گانے لگوں "باتیں نہ بناؤ جاؤ جی ـــــــ اور وہ سب جل کر گھورنے لگیں۔ ہائے اللہ کتنا مزا آتا ہے اس وقت۔ اور خاص کر حمیدہ کو دیکھ کر تو ہنسی کے مارے دم نکل جاتا ہے جب وہ گول گول منہ اور کبھی غصے میں پھلا لیتی ہے اور دانت پیس پیس کر اپنے سوالات کا جواب نہ سننے پائے اور سنجیدگی سے جواب کے بدلے جلا دینے والے گانے گائے جائیں جو بالکل ایسی لگتی ہے جیسے کھسیانی بلی کھمبا نوچنے پر آمادہ ہو اور کھمبا نہ پا کر میرے نرم نرم

بازوؤں کو بے اختیار نوچنے لگے ــــــ ہائے رے کتنے اچھے دن تھے
جب ہم بچپنے سے خفا ہو کر لڑکپن کو منا رہے تھے۔ ٹن ٹن ٹن ٹن ــــــ گھنٹی
کی آواز تھی گویا مضطرب دلوں کی ایک جا آواز تو بہ ہے خدا خدا کر کے ریسس ٹائم
ہوا کمبخت وقت ہی نہ کٹتا تھا۔ کونسی فلم چھوڑی ہو گی جس کے گانے نہ گائے
گئے ہوں کون سی ایکٹریس اور ایکٹر رہ گئے ہوں گے جن پر رائے زنی نہ ہو چکی ہو
کون سے رائٹر چھوڑے ہوں گے جن کے افسانے اور مضامین پر تبادلہ خیالات
نہ کیا گیا ہو۔۔ اور پھر ہر قسم کے ریشمی کپڑوں کی قیمتیں معلوم ہو گئی تھیں لاہور اور
بمبئی کا موجودہ فیشن معلوم ہو گیا تھا کہ آج کل جالی کا بے حد فیشن ہو گیا ہے، برسوں
ہی کی تو بات ہے جب دسویں کی لڑکیوں کو فیئر ویل پارٹی ہم لوگوں نے دی تھی۔
اور ہمارے سکول کی ملکۂ حسن قدسیہ موڈ کلر کی ریشمی جالی کی قمیص اور دوپٹہ
پہن کر آئی تھی سفید ساٹن کی شلوار تھی اور اس کا وہ سرخ و سفید رنگ سیاہ
بڑی بڑی چمکدار آنکھیں، سیاہ لمبی لمبی دو چوٹیاں جو شانوں پر ادھر ادھر پڑی
ہوئی تھیں۔ کتنا اچھا کٹ ہے اس کے جسم کا سو پچاس لڑکیوں میں ایک ہی
نظر آ رہی تھی۔ میں کبھی نہیں بھولوں گی جب وہ میرے سامنے کی کرسی پر بیٹھی ہوئی
اس کے بڑے بڑے ٹوپس کس قدر چمک رہے تھے اور گوری گوری باہیں
جالی کی فل سلیوز میں سے چھن چھن کر نظر آ رہی تھیں اس کے ہاتھ کتنے خوبصورت
تھے جب وہ سینڈوچز ۔۔۔۔۔۔) اٹھا کر سرخ سرخ کاٹتے ہوئے گیلے

گیلے ہونٹوں تک لے گئی تھی۔ لمبی لمبی خوبصورت سفید سفید سی انگلیاں اور تراشے
ہوئے لمبے لمبے پینٹ کئے ہوئے سُرخ سرخ سے ناخون، کتنی خوبصورت ہے
قدسیہ، تبھی تو میں نے اس کا نام ملکۂ حسن رکھ دیا۔ جیسے سن کر سرخ ہو جاتی ہے
اور گردن جھکا لیتی ہے اور پھر تھوڑی دیر میں اپنی خوشی کو چھپاتے ہوئے بناوٹی
غصے سے ایسی دیکھتی ہے کہ ———— نہ جانے اتنی اچھی کیوں لگتی ہے
کمبخت۔ روز تو خیر بنی ٹھنی رہتی ہے مگر جس روز ہماری اور اس کی کوکینگ تھی۔
اُس روز تو بھئی غضب کی خوبصورت لگ رہی تھی۔ سفید غرارے کے اوپر سفید
ایپرن اور ہیڈ کور میں سے ماتھے پر سیاہ سے بال جو پیچ دار گول گول دائروں کی
صورت میں ماتھے پر پڑے ہوتے تھے۔ بالکل نرس معلوم ہوتی تھی۔ ہائے رے
کتنا مزا آیا تھا اس روز جب کبھی کبھی یاد آجاتے ہیں وہ دن تو بس یہی جی چاہتا
ہے کہ پھر سے وہی دن آجائیں۔ وہی بات بات پر قہقہے لگانا فضول باتوں میں گھنٹوں
گذر جاتے تھے۔ وہ میری عزیز ساتھنیں۔ مجال ہے جو ایک لفظ میرے منہ سے
نکل جائے اور کوئی پورا نہ کرے۔ مگر اس کلاس کی لڑکیوں کی وجہ سے میں نے بھی
ہزاروں دفعہ سزائیں اٹھائی ہیں سالانہ امتحان میں جس روز اردو کا پرچہ ہوتا، خدا
جھوٹ نہ بلوائے۔ تین گھنٹے کا پیپر ہوتا اور ہم ایک گھنٹے میں ختم کر کے دوسرا پیپر
تیار کر کے پاس کی لڑکیوں کو دیدیتے جو سارے ہال میں باری باری چکر لگا رہا ہے
ساری کلاس کے ایک ہی جواب اور صحیح کوئی ٹیچر پاس سے گذری اور پوچھا

معلوم دیتا ہے روحہ تم پیپر ختم کر چکی ہو۔ ہم نے ذرا آنکھوں ہی آنکھیں ڈال کر ان کی
خوبصورتی کا جائزہ لیتے ہوئے مسکراتے ہوئے جواب دیا ہاں کر تو چکی ہوں، مگر
ابھی ریوائز کر رہی ہوں۔ کیا خیال ہے۔ اور وہ زور سے منکناتی ہوئی بل کھاتی ہوئی
نکل گئی۔ خدا کی قسم فوراً جل جاتی تھی نہ جانے کیوں۔ ہائے اللہ اتنا مزا آتا ہے کسی کو
جلانے میں۔ اور پھر ہمارے قہقہے۔ بل کھا کھا کے رہ جاتے ہیں جلنے والے، ان
کی بےچینی دیکھ کر بس یہی جی چاہتا ہے کہ منہ چڑاتے ہوئے دور کھڑے ہو کر انگوٹھا
چڑا اچڑا کر کہیں جلے کو جلائیں گے ـــــ اور ـــــ اور حلوا پوری کھائیں گے۔
لڑکیوں کے ساتھ تو اکثر یہی واقعات پیش آتے۔ مگر ٹیچرز کا تھوڑا سا ادب کرنا پڑتا
ہے وہ کیوں، اس لئے نہیں کہ وہ ہمیں پڑھاتی ہیں۔ اور بڑی ہیں، استاد ہیں اونہہ
ہرگز نہیں، کبھی بھی نہیں۔ صرف بابا جان کے الفاظ عین موقع پر گونجنے لگتے ہیں، کہ
روحہ بیٹا، بڑوں کا ادب ضروری ہے اور پھر استاد کا درجہ تو بہت ہی اونچا
ہے۔ کوئی شخص اگر الف بھی لکھنا پڑھنا بتائے وہ بھی استاد ہے۔ اف اللہ
اور دہ جانے کیا کیا کہا کرتے تھے مگر اس وقت تو صرف اتنا ہی یاد رہا ہے۔ گرہ میں
بھی بند ہو سکا۔ جو عین وقت پر تھام لیتا ہے۔ وہ دن تو کبھی نہ بھولوں گی جب
میں تنگ آ جاتی ہوں ان آج کل کے دنوں سے تو بس یہی جی چاہتا ہے کہ بھابی
جان کے کمرے میں چپکے سے جا کر ان کے لمبے چوڑے ڈبل بیڈ پہ زور سے چھلانگ
لگاؤں نرم نرم گدوں دار بستر میں دھنس جاؤں۔ مگر کمبخت کتنا لمبا چوڑا سا ہے

مگر ساتھ ساتھ کتنا نرم اور ساٹن کے گدّے جن پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے دل کبھی نہیں اکتاتا اور نیند ناخواندہ مہمان کی طرح ہم پر مسلط ہو جاتی ہے۔ وہی اسکول کے دن یاد آجاتے ہیں جب ہر روز نئی نئی شرارتیں سوجھتی تھیں۔ سچ کہتی ہوں کہ اب تو ہم بوڑھے ہو گئے۔ دانت نہیں ٹوٹے تو کیا۔ سر سفید نہیں ہوا تو کیا۔ ذرا اکھٹا چھائی اور ہم پچھلی طرف چلے گئے ڈالی خانے کے پاس۔ جہاں درخت ہی درخت ہیں ہری ہری گھانس اور ٹرلا دینے والے کھلے ہوئے گلاب سرخ سرخ' زرد زرد' گلابی گلابی اور اودے اودے گلاب۔ ہم ابھی چھوٹا گیٹ کھول کر اندر ڈالی خانے میں داخل ہی ہونا چاہتے تھے کہ بھائی جان اور بھابی جان مع ریزگاری کے پیچھے سے آتے نظر آئے جان ہی تو جل جاتی ہے سب بچے کھیل کود رہے ہیں۔ ہم نے سوچا لاؤ ذرا ہم بھی ان میں شریک ہو جائیں۔ اور ہم نے چپکے سے ثریا کو اشارہ سے کہا ہم بھی کھیلیں گے۔ اور ان کمبختوں نے چیخنا شروع کر دیا۔ او جاوید' ثریا رعنا آؤ روحہ آنٹی بھی کھیلیں گی آؤ جلدی ———— اور بھابی جان نے ناز سے کھا نسنا شروع کر دیا۔ روحہ بی بی اب تم بھی کھیلو گی خدایا کچھ تو سوچا کرو۔ اب تم بڑی ہو گئی ہو۔ جاؤ آج تم نے ذرا بھی نہیں پڑھا ———— نوٹس لکھ لئے۔ ہائے اللہ ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جی چاہا کہ ان کے سر میں لگی ہوئی مشین گنوں کو نوچ ڈالوں۔ بڑی آئی بال کرل کرنے والی خود تو ہر وقت یہی کوشش کرتی رہتی ہیں کہ میں خوبصورت نظر آؤں اتنی بڑی ہو گئیں ابھی فیشن میں کمی نہ آئے اور ہم کھیل بھی نہیں سکتے۔ بھائی جان کے

کہنے پر کہ کھیلنے دو آج موسم اچھا ہے۔ کیا ہوا" تو کس انداز سے ان کی طرف دیکھ کر مسکرائی ہیں۔ کہ آپ کی طرح سے اس کا ڈر بھی بچوں پر نہیں رہے گا۔ جب یہ خود ان کے ساتھ کھیلے گی۔ آپ کا کونسا رعب ہے بچوں پر دیکھئے گا ابھی سب بچے آپ کے پاس آئیں گے کہ پاپا جان آپ کھیلئے ہمارے ساتھ۔ بھلا مجھ سے تو کوئی کہہ کر دیکھے۔ میرا جی چاہا کہ زور سے کہوں۔ جناب کا کیا خاک رعب ہے۔۔ ابھی اگر بچوں کو روحہ آنٹی کا حکم ملے کہ بچو ٹیل مارچ کرتے ہوئے اپنی جلاد ممی پر چڑھائی کر دو تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آڑے وقت میں ما بدولت ضرور کام آئیں گے۔ جو ممی جان کے رہے سہے اوسان بھی جاتے رہیں۔ وہ تو نہ جانے کیا سوچ کر رہ جاتی ہوں۔

بھابی جان کا یہ لمبا چوڑا پلنگ کتنا اچھا لگتا ہے۔ نرم نرم گدوں میں لپٹی ہوئی دھنسی ہوئی بے بس سی۔ زندگی کی تصویریں موت کا عکس، ہائے اللہ کتنے بڑے ہوتے ہیں پہاڑ سے دن جو کاٹے نہیں کٹتے۔ کتنے اچھے دن تھے وہ۔ جی چاہتا ہے پھر وہی دن آ جائیں۔ وہی بات بات پر قہقہے، وہ دن کبھی نہ بھولوں گی، ہاں شاید جمعہ تھا اس روز ہماری کوکنگ تھی۔ مسز شاغل نے بلو برڈ کی سٹوری ختم کرتے ہوئے گھڑی دیکھی ان کی چھوٹی چھوٹی سیاہ چمکدار نگاہیں گھڑی کی سوئیوں پہ تھمی اور ادھر ٹن ٹن گھنٹی بجی۔ خدا خدا کر کے وقت ختم ہوا، مگر ہمارے گروپ کی لڑکیوں کے چہروں پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ہائے اللہ روحہ، کچھ کرو، بتاؤ

کوئی ترکیب، غضب ہے۔ کسی کو یاد نہیں رہا کہ آج کوکنگ ہے کوئی بھی تو میرے سے
اپنی ایپرن نہیں لائی۔ اقبال نے اپنی گول گول آنکھیں پھراتے ہوئے ڈرتے
ہوئے چہرے سے مجھے دیکھا۔ اوہو! مہاتم کی بات سنی، مہارانی جی ہمیں تو خیر یاد
نہیں رہا بس اتنی جلدی آ گئی تھی۔ اس کا ثبوت ہے یہ میرا کنگھا، چوٹی بھی نہیں
گوندھی ہے۔ کہیے آپ، کہ یہ دو چوٹیاں گوندھنے میں جو وقت ضائع کیا، اس
عرصے میں سینکڑوں چیزیں یاد آ سکتی ہیں۔ کیوں ہے نا فیروزہ نے اپنی ناک کا
ایک سرا اونچا کر کے مٹکتے ہوئے جملہ پورا کیا۔ اور داد طلب نگاہوں سے میری
طرف دیکھنے لگیں، مگر صاحب ہم کوئی ایسے خطرناک موقع پر لڑائی کروانا چاہتے تھے
کبھی نہیں ہونے دیتے سب کو ہنسانے کی کوشش کرتے ہوئے ڈانس کرتے ہوئے
کہا۔ عادت ہے تمہری کھراب، برا نہ مانو سمجھیں۔ لڑنا کھراب بات ہے۔ اب فکر
کرو کہ ہم ـــــ کتنی لڑکیاں ہیں ہمارے گروپ میں ایک دو تین چار، چار اور
چار آٹھ ہوں ہوں، آٹھ لڑکیاں اور ایک ایپرن اور جس کا ہیڈ کور بھی نہیں تھا۔
بھلا ڈانٹ کھانے کی بات تھی نا۔

اب جو ہم نے پلٹ کے دیکھا تو ساری کلاس کی لڑکیاں غائب اب میں
تھی اور سات یتیم بچے جن کے منہ کھلے اور ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ سب سے پہلے
میں اس کی انگلی پکڑ لوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں، آخر ہم نے ایک عدد
بڑے کیتلی اور دو پتیلیوں پہ ہی اکتفا کیا اور سب لڑکیوں کو ساتھ لئے جلدی

جلدی میز کے پاس پہنچی میز پر گرد جمی ہوئی تھی۔ آٹھوں لڑکیوں نے ایک دوسری
کی طرف دیکھا مگر ہر ایک اپنے اردگرد دیکھ کر اودے نیلے کاسنی اودے سلیٹی
عنابی چھنے ہوئے دوپٹوں کے پلو پکڑ پکڑ کر آہستہ سے چھوڑ دیئے۔ آخر ہم نے
جھاڑن کا کام اپرن سے لیا۔ اور میز صاف کرنے لگی۔ صادقہ کو پیالہ دے کر
بھیجا کہ جاؤ جہاں دودھ بٹ رہا ہے۔ اس پیالے میں لے آؤ۔ اقبال کو ٹوکری
دی کہ کھٹملے لائے۔ فیروزہ کو سبزی دی کہ دھو کر کاٹو۔ عزیزہ کو کاغذ لانے کو بھیجا
حمیدہ کو برتن دھونے کو بھیجا۔ ہم ابھی میز صاف کر ہی رہے تھے کہ عزیزہ ناک
سکیڑتی ہوئی ہاتھ ہلاتی ہوئی ناکام واپس آئیں۔ ہماری جان ہی تو جل گئی۔ خیر
اپنی قسمت کو کوستے ہوئے برابر کی لڑکیوں کی میزوں کو حسد بھری نگاہوں سے
دیکھتے ہوئے جن کی میزوں پر تازے اخبار بچھے ہوئے تھے۔ ہم اپنی
غریب میز کو دھوبی کے دھلے ہوئے اپرن سے صاف کرنے لگے۔ مجبوری کیا
کرتے۔ ہمارے گروپ کی لڑکیاں تھیں اور فیشن تھا، ان کو اپنے بننے سنورنے
ہی سے فرصت نہ تھی۔ آخر میں اکیلی کیسے کرتی۔ میں جل رہی تھی اور میری ساتھنیں
مسکرا رہی تھیں، کچھ کھڑی ہوئی لمبی لمبی سیاہ چوٹیوں میں گرہیں لگانے پر
مجبور تھیں۔ عقیلہ اپنا بھاری جسم چھوٹی چھوٹی ٹانگوں پر بمشکل اٹھائے کمرے میں
داخل ہو سکی سانس بری طرح سے پھول رہا تھا۔ اس حالت پر بھی غصے سے انہیں
غصہ آ رہا تھا۔ اے لو روحہ غضب کر دیا ابھی جناب میز ہی صاف کر رہی ہیں

اور رشیدہ کے گروپ کی تو آگ بھی جل گئی۔ فیروزہ نے گیلے ہاتھوں کو ہمارے
سفید سے ایپرن سے جو اب کہیں کہیں سے کالا ہو گیا تھا۔ میز صاف کرنے
سے پوچھنا شروع کر دیا اور بڑی بڑی آنکھوں سے گھورتے ہوئے کہا، واہ واہ
خوب مارو حد آخر تم اس قدر سست کیوں ہو گئی ہو۔ میں سبزی بھی دھو لائی اور
جناب ابتک میز نہیں صاف کر چکیں۔ یعنی عجیب ہو تم بھی۔ اور ہم نے ٹالتے
ہوئے کہا اوہو ابھی تو ابتدا ہے مگر نہیں صاحب اقبال کب چپ رہنے والی
تھی، اوہو بڑی آئیں ابتدا کرنے والی، سب کا پک کر تیار بھی ہو جائے گا۔
اور ان مہارم کی ابھی ابتدا ہوئی۔ اوہو ابتدا، ساری شاعری آج چولہے ہی کے
پاس ختم ہو جائے گی۔ اچھا جی۔ اور ہم نے دور سے اپنی کوکنگ ٹیچر مس حمیدہ کو
آتے ہوئے دیکھا۔ مگر وہ دوسرے گروپ کے پاس کھڑی زور زور سے کچھ کہہ رہی
تھی مگر بہت دور ہم تک صرف بھنبھناہٹ ہی پہنچ سکی۔ اور ہم نے ذرا آہستہ سے
اپنے ماحول سے تنگ آکر گنگنانا شروع کر دیا۔ ہماری "سہت آنا"! چھاجی
اور اب سب ہمارے ساتھ مل گئی تھیں۔ بے سری آوازیں بھی اس خوشی میں
شریک تھیں۔ بالکل چھوٹا سا جشن ہو رہا تھا۔ نسبتاً اور گروپس کے وہاں
تو چھیم دھاڑ مچ رہی تھی۔ ہمارے ا چھاجی یہ ساری لڑکیاں زور سے ہنس
پڑیں۔ ابھی قہقہے آدھے بھی نہیں ہوئے تھے کہ خدا کے لئے چپکی رہو صادقہ
کی آواز سنائی دی۔ جو کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ مع برتنوں کے ایک

ٹوکرے کے ہمراہ، ہماری جان میں جان آئی۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ ایک کفگیر
تو آیا نہ چمچہ تھا نہ چھری تھی نہ اور کوئی دوسرے برتن تھے۔ اب سوال یہ پیدا
ہوا کہ پکائے کون۔ یہ سن کر سب ہنسنے لگیں یہاں خیر سے سب صفر ہی تھے۔
آخر سب چلا اٹھی تھیں روحہ کو پکانا آتا ہے۔ کیونکہ یہ ابھی دوسرے گروپ کی
لڑکیوں سے کہہ رہی تھیں کہ پہلے سبزی رکھو۔ ہم اپنی اصلیت کو اپنے دل میں
محسوس کرتے ہوئے دل ہی دل میں جھینپ رہے تھے۔ مگر خاموشی اس
وقت ساتھ دے گئی۔ اگر ذرا بھی بولتے تو ساری شیخی کرکری ہو جاتی۔ معاملہ یہ
تھا کہ چلتے وقت تھیلے میں کاپی رکھ لائی تھی۔ جو معلوم تھا کہ ضرور کام آئے گی
بیچاری غریب قمر اس اثنا میں کوئلے کی ٹوکری اٹھائے دونوں ہاتھ سخت کالے
اور ناک اور گورے گورے رخساروں پر نظر بد کے نشان لگائے داخل ہوئیں
گویا ہنسی کا مرقع۔ ہم میز صاف کرتے کرتے میز پر جھک گئے کہاں کرتی اور ہنسی
رکتی ہی نہ تھی اور ڈر تھا کہ شور نہ ہو۔ ایک دفعہ ہی عزیزہ ہنستے ہوئے ہم
پر آن پڑی اور عزیزہ پر حمیدہ۔ اور اقبال ہائے رے قمر ہنستے ہنستے غریب
موٹی عقیلہ اور حمیدہ پر آن پڑیں ایک پر ایک، اور ہنسی کی عجیب قسم آوازیں
بمشکل روکنے پر بھی نکل رہی تھی۔ جیسے کسی گتے کی آواز کا ریکارڈ لگا دیا
جائے۔ اور اس کی اسپیڈ کم ہو گئی ہو۔ چابی کی کمی کی وجہ سے عجیب عجیب
سی آوازیں تھیں۔ جن کو سن کر اور بھی ہنسی آ رہی تھی۔ ہمارا برا حال تھا۔

دبلی پتلی موٹی موٹی ساری کی ساری ہم پر لدی ہوئی تھیں۔ پسینے کے مارے برا حال تھا فیروزہ دروازے کا سہارا لئے منہ کھولے بے تحاشہ ہنس رہی تھی ناک کے نتھنے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ صرف صادقہ ہی ایک امن پسند لڑکی تھی جو کبھی ہنستے ہنستے بے دم ہو جاتی تھی اور کبھی کبھی نصیحت بھی فرمانے لگتی۔ خیر خدا خدا کرکے قمر کو احساس ہوا۔ اور وہ بھاگتی ہوئی ہماری نظروں سے غائب تھی۔ اب جو پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو ہماری ڈومیسٹک سائنس کی ٹیچر جمیلہ عارف ہمارے پیچھے کھڑی تھیں۔ چلئے اندر ـــــ سب کی نظریں ڈومسٹک سائنس کے کمرے کی طرف اٹھیں۔ وہاں کا نقشہ ہی پلٹا ہوا تھا ہر ایک سادہ لڑکی منہ پر انگلی رکھے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھیں ـــــ چہرے ہنسی کو ضبط کرنے کی وجہ سے سرخ ہو گئے تھے۔ اب معلوم ہوا کہ ہم ہی نہیں سب ہی لڑکیاں شور مچا رہی تھیں۔ جس کی سزا یہ ملی ہم بھی اپنے تیمیم بچوں کی انگلیاں پکڑے کھڑے ہیں تھے۔ اس جرم کی رہائی اس پر تھی کہ جب تک وہ دوہ دو آئے ساری لڑکیاں بھی خاموش کھڑی رہیں۔ ہم نے سب سے کہا کہ ایک ایک لڑکی خدا سے دعا مانگے اور گھر جا کر ایک ایک بھوکے فقیر کو کھانا کھلائیں۔ سب کے منہ کھلے ہوئے تھے ارے پکانا تو آتا نہیں اور جناب مولانا فرما رہے ہیں کہ ایک بھوکے فقیر کو کھانا کھلاؤ، ہمارے بس کی بات نہیں رہی دعا تو وہ مانگے لیتے ہیں اور

سب کے لب تھرتھرانے لگے۔ ارے میں نے چیخ کر کہا۔ تم لوگ نوحہ کرتی ہو کوئی بھی سیر بھر سی دعا مانگ رہا ہے۔ ہنسی کے مارے تمہاری روح تڑپ رہی ہے۔ اوہو۔ اگر ایسی دعائیں بارگاہ عالی میں قبول ہونے لگیں تو جناب آج ہم یہاں حمیدہ عارف کی دھونس میں سزا میں کھڑے رہتے چھوٹے بچوں کی طرح قسم قسم۔ اور قدسیہ نے منہ چڑاتے ہوئے حمیدہ عارف کی پیٹھ کو غور سے دیکھا جو بہت دور ہماری طرف سے پیٹھ کئے کھڑی تھی ـــــ دیکھا انہیں اتنی فرصت مل جاتی ہے کہ اپنی شمیز میں کیسی اچھی کروشیہ کی بیل بناتی ہے۔ اور ہمارے اسکول کی رمولا نے اپنی دونوں چوٹیوں میں گرہ لگاتے ہوئے کہا۔ سفید وائل کے ٹائٹ بلاؤز میں سے چھلکتے ہوئے کروشئے کے بنے ہوئے اسٹریپس۔

ارے میری دعا قبول ہوئی صادقہ نے ناز سے مسکراتے ہوئے کہا جیسے انہی کی دعاؤں کا یہ اثر ہے جو چپڑاسن دودھ کی بالٹی لئے ہوئے آ رہی تھی۔ اونھ میں نے منہ چڑا دیا ـــــ اور صادقہ کی آنکھیں چمک رہی تھیں جیسے وہ مجھے بیوقوف سمجھ رہی تھی ـــــ اب ہم سب پھر اپنی میز کے پاس تھے۔ جلدی سے عزیزہ نے انگیٹھی سلگائی۔ اور ہم نے جلدی سے کتاب دیکھی معمہ حل ہو گیا۔ اتنے میں کتاب کے اور بھی گاہک پیدا ہو گئے۔ فاطمہ، زبیدہ، امۃ السلام وغیرہ۔ خیر ہم نے سب کو بہکانے کی

ترکیب بتا دی اور اب ہم ایک اچھے باورچی کی حیثیت سے اکڑتے ہوئے انگیٹھی کے پاس آ بیٹھے۔ معاملہ تیار تھا۔ سوجی چینی ملا کر دیگچی چڑھا دی۔ ایک دفعہ ہی ہم پر بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ کیوں کیوں ؟ ہاییں ہیں ! ارے ؟ کیا کر رہی ہو ؟ ارے بھئی پانی تو ڈالو ——— مشہور مشہور ڈائرکٹرسیں اپنی اپنی رائے دے رہے تھے۔ ہم مسکین صورت بنائے بات ٹالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر صاحب۔ سب بے سود ——— ہمارے گروپ کی ساری لڑکیاں دوسری میز کی لڑکیوں سے پوچھ رہی تھیں۔ ہمیں بہت ہی ہنسی آئی کہ یہ سب ہم ہی سے تو پوچھ کر گئی تھیں۔ سب واپس کھسیانی بلیوں کی طرح آئیں۔ ہائے رے روحہ کی بچی تم نمبر کٹواؤ گی فیروزہ اپنی چھوٹی سی کھلی ہوئی چٹیا کو لپیٹتے ہوئے کہا۔ ہم جل ہی تو گئے۔ تو جناب آپ خود ہی پکا لیں۔

آخر میں اتنی محنت کر رہی ہوں۔ کیا یہی صلہ ملا ہے اس کا۔ اچھا اچھا تم کام کرو ورنہ پکنے دو انہیں صادقہ نے ہماری صفائی کراتے ہوئے۔ آہستہ سے کہا اور فیروزہ کو گھورنے لگیں۔ ہم نے پھر کام شروع کر دیا اور اب بھری چیز تیار کرنے لگے۔ یعنی سبزی کا شوربہ۔ صادقہ کو پالک کترنے کو دیا۔ اور عزیزہ کو آلو اور ہم کترتی ہوئی پیاز کو نل پر لے کر گئے۔ وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ قمر صاحبہ اطمینان سے دوسرے گروپ کی لڑکیوں کے سامنے فیشن کے بارے

ہیں دھواں دھار تقریر کر رہی تھیں ہماری جان ہی تو جل گئی۔ ہم تو جب سے کام کر رہے ہیں اور آپ کو فرصت کا وقت ملا ہے بحث کرنے کے لئے کام ہم کریں اور نام سب کا ہو ہمارا جی جل گیا کہ ہم بھی نہ کچھ کریں۔ واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔ بڑی آئیں کہیں سے اور ہمیں گھورتے ہوئے خون کے گھونٹ پیتی ہوئی کمرے میں واپس آ گئی۔ خیر خدا کا شکر کہ ہماری ساری چیزیں پیالیاں پیڑیاں وغیرہ دیگچیوں میں تھی، گویا بہت بڑا کام ختم ہوا، ابھی ہم اپنا پسینہ پونچھ کر انگیٹھی کے پاس سے اٹھے ہی تھے کہ صادقہ دودھ کا پیالہ لئے پیشانی پر ہزار دل بل پڑے ہوئے تھے۔ اور ہانپتی ہوئی داخل ہوئی اور میز پر زور سے پیالہ رکھا جس سے ہماری سفید اپرن سے صاف کی ہوئی میز پر دودھ ہی دودھ تھا ——— ہم سب یکدم چیخ اُٹھے خیر تو ہے بھئی کیا ہوا۔ ارے! ہائے ہائے غضب ہو گیا اور سارا دودھ گر گیا۔ نہیں نہیں تھوڑا سا باقی ہے، یہ تھی چیخ پکار جس کو سن کر اور اس عجیب واقعہ سے ہم اور بھی گھبرا گئے ——— اور سب کی نگاہیں صادقہ کے پاؤں پر تھیں۔ مگر خاصہ گورا چٹا پاؤں تھا۔ چوٹ وغیرہ تو کہیں بھی نظر نہیں آتی تھی پھر یہ پاؤں کیوں پکڑے ہے۔ آخر ہم نے جھک کر پوچھا۔ بھئی خیر تو ہے کیا ہوا۔ کچھ تو بتاؤ، کچھ منہ سے بولو سر سے کھیلو آخر یہ اللہ واٹی کھٹواٹی لے کر کیوں بیٹھی ہو (لیٹی نہیں) اور صادقہ نے بڑی بڑی معصوم آنسوؤں سے لبریز نگاہوں سے ہمیں دیکھتے ہوئے کہا، آپ سب

تو مزے سے میز پر چڑھی بیٹھی ہیں اور ہم جب سے کام کر رہے ہیں۔ معلوم ہے
دودھ لیتے وقت کتنی تکلیف اٹھائی بڑی لڑکیاں وار ہی نہیں دیتی تھیں جو
ہے وہ سب سے پہلے لینا چاہتی تھی۔ اس کی گواہی۔ یہ ہمارے دوپٹہ کا
پلو دیکھو۔ کتنا پھٹ گیا ہے' چہ چہ ہم نے ہمدردی جتاتے ہوئے انگلی سے
پاؤں کی طرف اشارہ کیا اور صادقہ ہر مصیبت دشمنوں کے گلے اس پاؤں
میں کیا ہوا۔ اوخہ۔ کیا ہوا میرا تو آج جتنا نقصان ہوا ہے وہ میں ہی جانتی
ہوں دیکھو یہ ننھی چپل اس کا اسٹیپ ٹوٹ گیا۔ اب میں کیا پہنوں گی' اور گھر
کیسے جاؤں گی خوب صاحب خوب اچھا کیا یا' اور وہ منہ کھولے تیوری پہ
بل چڑھائے باہر دیکھتے ہوئے چیخیں اوہ ارے غضب مس عارف آ رہی ہیں
ارے میز پہ سے دودھ تو صاف کرو ———— ارے واقعی' کپڑا دو —
ارے کوئی کاغذ ہی لے لو۔ جلدی کرو ارے وہ اب آیا ہی چاہتی ہیں۔ بھئی کھڑی
کھڑی کیا دیکھ رہی ہو۔ وہی ایپرن لے لو۔ ٹھہرو ٹھہرو۔ ہم جلدی سے میز کے
کنارے کے پاس پیالہ لگا دیا۔ اور سارا میز کا دودھ جو اب ٹپا لرسا ہو گیا تھا پیالے
میں آگیا۔ ارے۔ یہ کیا۔ ارے سفید باقی دودھ کو بھی کالا کر دیا۔ اور تم نے یہ کیا
کر دیا۔ اور صادقہ ایک چھلانگ لگاتی ہوئی ہمارے پاس آئیں ————
بھئی ہم نے بیوقوفی نہیں کی دودھ کم ہو گیا تھا۔ اور کہاں سے ملتا۔ اونی۔ ہائے
ارے اوہ۔۔۔۔۔۔آ۔۔۔۔۔۔ منتفرق تھیں تھیں جنہوں نے ہمارے ایسے سے

اوسان بھی ختم کر دے۔ کہا ہے بھئی خدا کے لئے ذرا آہستہ بولو اس قدر چیخ کیوں رہی ہو۔ اور ہم نے مڑ کر دیکھا تو تیز دہکتی ہوئی انگیٹھی ہمارے قریب الٹی پڑی تھی۔ جس پر ہم ابھی دودھ ابالنے والے تھے ارے جلدی کرو۔ ارے مس عارف۔ دوسرے گروپ کے پاس کھڑی ہیں اب ادھر بھی آنے والی ہیں ارے مس عارف سب زور زور سے چیخ رہی تھیں اور کام کوئی بھی نہیں کرتا تھا۔ ہم نے جلدی سے چینی کی پلیٹ اور چمٹے کی مدد سے دہکتے ہوئے انگارے ـــــ انگیٹھی میں واپس ڈالے اب چھوٹے چھوٹے کوئلے باقی رہ گئے تھے۔ اور گرم گرم راکھ تھی۔ ہم نے سوچا تھا کہ اس کو اٹھانے میں تو دیر لگے گی اسے جھاڑو سے صاف کر دیں گے اور ذرا سبزی کے شوربے کی دیگچی رکھ دیں نہیں تو ٹھنڈی ہو جائے گی۔ اس کا ڈھکنا بھی غائب ہو چکا تھا نہ جانے کہاں۔ ہم اٹھا کر میز پر سے ایک پلیٹ لائے اب جو لڑکیوں پر نظر پڑی تو کسی کو ہوش نہیں۔ اور دبے دبے قہقہے کوئی اپنے منہ میں دوپٹہ ٹھونسے پیٹ ایک ہاتھ سے دبائے جھکی جا رہی ہے سب کے منہ سرخ ہیں آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے ہیں ـــــ سب کا ہنسی کے مارے برا حال تھا۔ مگر ہماری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا آخر صادقہ نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے نتھنے پھلاتے ہوئے دیگچی کی طرف اشارہ کیا۔ ہم نے جو جھک کر دیکھا تو دیگچی کی ملگجی سے پانی کی سطح پر کالے کالے ننھے ننھے کوئلوں کے ذرے تیر رہے تھے۔ یہ کسی

لے کیا۔ ہم نے غصّے سے پوچھا۔ یہ ——— یہ میں نے ——— کیونکہ میں کبھی
کہ انگیٹھی پر ابھی دیگچی نہیں رکھی ہے۔ بس سارے کوئلے چن چن کے ڈالدوں
اب جو میری رکابی دیگچی سے ٹکرائی تو میں نے دیکھا کہ انگیٹھی کے اوپر دیگچی رکھی
ہے مگر ساری راکھ اور کوئلے دیگچی میں گر چکے تھے۔ اب پھر سب کا برا حال تھا
ہم نے کہا بھئی آج تو خدا ہی کرے تو خیر ہو۔ نمبر تو گئے۔ سب سے پہلے کسی
کے پاس ایپرن نہیں۔ صادقہ کی چپل ٹوٹی اس غریب کا دوپٹہ پھٹا اور ساری
میز پر دودھ گر گیا۔ پھر انگیٹھی گری۔ اور اس کے بعد یہ کہ سبزی کے ہرے
رنگ میں سیاہی مل گئی۔ بھلا مریض کیا اس کھانے کو کھا کر زندہ رہ سکتا
ہے۔ ہم ابھی یہیں تک کہنے پائے تھے کہ مس عارف کی ساڑھی کا سرخ
بارڈر نظر آیا۔ اور ہم نے انگلی سے سب کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ اب سب
کی ہنسی ختم ہو چکی تھی۔ مگر اپنی اصلی حالت میں ابھی کوئی نہ تھا۔ مگر مس عارف
ہمیں مسکراتی ہوئی گہری گہری نظروں سے دیکھتی ہوئی پاس سے نکل گئیں سب
نے خدا کا شکر ادا کیا مگر ہمارا ماتھا ٹھنکا کہ ان کی مسکراہٹ اور ان کی اس
گہری نظر میں کچھ پوشیدہ ہے۔ ہم نے دیگچی اتار کر سبزی کا عرق نکالا، چائے
بنائی اور سارا دودھ سبزی کے عرق میں ڈال دیا۔ کیا کرتے۔ راکھ اور کوئلے
کی سیاہی کو بھی چھپانا تھا ———

ساری لڑکیاں کمرے میں تھیں، مس عارف ہر ایک کی چیزیں دیکھ رہی

تھیں ہم سب کے دل دھڑک رہے تھے۔ روحہ تمہارا شوربہ بہت خراب ہے۔ مریض ایسا شوربہ پی کر ایک منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور جس روز آپ کی کوکنگ ہو آپ لوگ شلواریں پہن کر آئیں کیونکہ غرارہ پہننے سے اور پھر بدحواسی سے بھاگنے سے ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ تو خدا نے بچا لیا کوئی جلا نہیں۔ اور وہ مسکرا کر دوسرے گروپ کی چائے کو چکھ رہی تھیں میں ایسا معلوم ہوا کہ پسینہ میں ہم ڈوب گئے ہیں دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اوہ روحہ۔ ارے بھئی خدا کے لئے شام کے چھ بج گئے اور تم اب تک سو رہی ہو کس قدر کاہل ہو گئی ہو۔ میں تم کو پکچر نہیں لے جا سکتی تم ابھی تیار بھی نہیں ہو۔ اور بھابی جان سینٹ میں بسی ہوئی۔ پیلے ربن اپنی دو چوٹیوں میں باندھ رہی تھیں۔ ریشمی پیلا غرارہ اور ہلکے پیلے رنگ کی جالی کی فل سلویز کا کرتہ۔ کس قدر خوبصورت کتنی حسین معلوم ہو رہی تھیں۔ سیاہ کرل سے بال جو دو حصوں میں ریشمی چمکیلے ربن میں بندھے ہوئے دونوں شانوں پر پڑے ہوئے تھے بھینی بھینی سینٹ کی خوشبو کار کا ہارن زور سے بجا۔ "اچھا" "ٹو منٹس" بھابی جان نے چیخ کر بھائی جان سے کہا جو باہر کار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کیونکہ ان کی ریزگاریا نہ انہیں پکڑ لیں اور ان کے پروگرام کی تنہائی ساری تباہ ہو جائے۔ میں نے جل کر کروٹ لی۔ بھابی جان کے لمبے چوڑے نرم نرم ڈبل بیڈ پر میں کسمسا کے رہ گئی۔ بھابی اب آئینہ میں اپنا غازہ درست کر رہی تھیں تاکہ رخساروں کی

زردی شہابی رنگ میں تبدیل ہو جائے۔ اچھا رحمہ تم کل چلی جانا ان سب بچوں کے ساتھ۔ دیکھو ان نالائقوں کا خیال رکھنا۔ بے بی کو ساڑھے سات بجے دودھ بنا کے دیدینا۔ اور وہ لپ اسٹک درست کرتی ہوئی کمرے سے بھاگ گئیں۔ اور موٹر اسٹارٹ ہوئی اور ایک سنسناہٹ سی چھوڑتی ہوئی کب کی جا چکی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ نہ وہ اب اسکول کا زمانہ تھا۔ نہ وہ معصوم سی ساتھنیں نہ وہ بات بات پر قہقہے۔ اب تو ان قہقہوں کی جگہ آنسوؤں نے لے لی تھی۔ میں نے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا رونے کی وجہ سے آنکھیں ہلکی ہلکی سرخ ہو گئی تھیں۔ اور اب رونے سے پلکیں بھی بھیگ گئی تھیں میں نے کمرے کی بتی بجھا دی اور ڈرائنگ روم میں ریڈیو کھول کر بیٹھ گئی۔ سنہری سی روشنی میں کھڑکھڑ کے بعد ایک سنسناہٹ کے ساتھ سریلے نغمے ابل پڑے۔ میں نے پنکھا اور بھی تیز کر دیا تھا کیونکہ میری قمیص پسینے میں بھیگ گئی تھی اور میری آہ نکل گئی۔ ریکارڈ بج رہا تھا۔ پردیسی امی امی کیوں یاد آتا ہے؛ جب بیتے دن یاد آتے ہیں۔ پردیسی امی ———

اور میں نے سنا کہ برآمدے میں ریزگاریاں آپس میں لڑتے ہوئے، ممی۔ پاپا جان کو آوازیں دے رہے تھے میں نے ریڈیو کی والیوم تیز کر دی۔ جب بیتے دن یاد آتے ہیں ———

...تم کو خبر ہونے تک

سب کچھ وہی، کمرہ وہی، چھوٹی سی میز، کپڑوں کی الماری۔ کتابوں کی الماری
وہی نیلا سا چھوٹا سا کمرہ۔ کونے سے لگا ہوا نرم سا پلنگ۔ سب کچھ وہی ہے
مگر اس میں زندگی نہیں۔ مردنی سی چھائی ہوئی ہے۔ جیسے ابھی ابھی کسی
کا جنازہ یہاں سے اٹھا کر لے گئے ہوں ـــــ جیسے بہت ہی شور کے
بعد تھوڑا سا سکون مل جائے ـــــ ایک قسم کی سائیں سائیں سی
سنسناہٹ سی۔ کانوں کے قریب سیٹیاں سی بجاتے ہوئے ہواؤں
کے جھونکے۔ جیسے اس پڑی ہوئی چک سے ٹکرا کر بھاگ رہے ہوں۔
سیدھے۔ نیلی سی لمبی چوڑی سڑک کو پار کرتے ہوئے اس باغیچے کے
لمبے لمبے درختوں میں چھپے ہوئے پرندوں سے سرگوشیاں سی کر رہے

ہوں۔ باغیچے کے پیچھے کھیتوں سے واپسی پر تھرتھراتے ہوئے گیت دھندلے سے سرمئی آسمان کی اُداس اُداس سی فضا میں تیرتے جا رہے ہیں۔ دور کھیتوں سے ملی ہوئی زمین اور آسمان اسی شام کے دھندلکے میں شرماتے ہوئے ایک دوسرے کو چوم رہے ہیں۔ گرم زمین کے رخسار آسمان نے ٹھنڈی ٹھنڈی بھیگی ہوئی سرمئی سی چادر سے ڈھانپ دیئے۔ اس شام کے اداس دھندلکے میں سر جھکائے ہوئے خاموشی سے بیل آہستہ آہستہ ایسی اداس سی گھنٹیاں بجاتے چلے آرہے تھے۔ جیسے جنازے جا رہے ہوں مرگھٹوں پہ ــــــ

اُف یہ شام کس قدر افسردہ ہے۔ اور پھر یہ زندگی اداس و افسردہ سی جیسے دبے دبے گھٹے گھٹے سے سانس مجبوراً لے رہی ہو۔ یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں اب آہیں کیوں بھرنے لگیں۔ ہرے بھرے کھیت۔ وہ پھولوں سے بھرا ہوا باغیچہ اب سیاہ سی چادر کیوں معلوم ہونے لگا۔ یہ ساکت سے اونچے اونچے درخت۔ جیسے ٹہنیوں میں اب جان ہی نہیں۔ ان اونچی نیچی سیاہ گھاٹیوں کو طے کرتے ہوئے گوالے کیسے رنجیدہ سے سروں میں گاتے ہوئے جا رہے ہیں ــــ جیسے اس تاریکی میں سیاہ سی گھاٹیوں میں اب یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھو جائیں گے ــــ کمرے کی الماریوں پہ پڑے ہلکے نیلے

پردوں پر مٹیالی سی گرد کی تہ جم گئی ہے ـــــ باریک مٹیالہ سا
پردہ جو بغیر ڈالے ڈل گیا ہو ـــــ مگر اب اس کمرے میں اتنی اُداسی'
کتنی خوفناک سی سرسراہٹ ہے ـــــ جیسے پردوں سے گلے ملتی
ہوئی۔ کمرے کے کونے کونے سے کوئی بچھڑی ہوئی روح خاموشی میں
سرگوشیاں کر رہی ہو ـــــ کوئی چلتے چلتے جیسے رک جاتا ہے ـ
ہائے کتنا عجیب ہے یہ کمرہ ـــــ یہ وہی چھوٹی سی میز اور کرسی ہے
جہاں صہیب پریشان سے بال کیئے ہوئے میز پہ بکھرے ہوئے کاغذات
کو اپنی چمکدار۔ خوبصورت بوجھل سی آنکھوں سے گھورا کرتا تھا ـــــ
صہیب ـــــ ان ہی کا یہ بستر ہے۔ نرم نرم سا۔ نیلا پلنگ پوش
جیسے وہ ابھی ابھی اٹھ کر کہیں باہر گیا ہے اُسی طرح پلنگ پوش پر پڑی
ہوئی سلوٹیں ـــــ جیسے ابھی ابھی تڑپ کر سو گئی ہوں۔ پلنگ کے
نیچے ایک درجن کے قریب جوتے جن پر مٹی کی گرد کی تہیں جم گئی ہیں۔
سامنے اس میز پر رکھی ہوئی خوبصورت سی چمکدار فریم میں چغتائی
ـــــ کی بنائی ہوئی تصویر۔ وہی غالب کے مشہور شعر کا عکس ـــــ

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

اس سہ رنگی تصویر پر بھی مٹی نے باریک سا پردہ ڈال دیا۔ جیسے :۔

بھی صہیب بھیا کے جذبات کو عریاں نہیں ہونے دینا چاہتی تھی،
کس قدر خاکساری ہے ——— مگر صہیب کس قدر عجیب ہیں
کتنے غمزدہ۔ کاش میں ان کا غم کم کر سکتی ——— آج سے پانچ سال
پہلے۔ ایسی ہی شام آئی تھی، اداس سی شام۔ جب میں شاہ رخ، اور
رخسانہ کے ساتھ سیر کر کے واپس آ رہی تھی ——— کتنا اندھیرا
ہو گیا تھا ——— اور سردی بھی کس قدر تھی۔ چسٹر لپیٹے ہوئے
تھی مگر کانپ رہی تھی ——— کتنی گھر پڑ رہی تھی۔ چاروں طرف،
کھیتوں کی پگڈنڈی سے ہوتے ہوئے ہم سیدھے اپنے باغیچے کی
طرف سے آنکلے ——— سامنے برآمدے میں جیسے ہی میں
نے قدم رکھا۔ اس اندھیرے میں صہیب کرسی پر پریشان بال کئے
ہوئے بیٹھے تھے ——— چمکدار آنکھوں میں شاید آنسو بھی تھے۔
کتنا مرجھایا ہوا سا چہرہ تھا ——— وہ چپکے بیٹھے ——— سرمئی
سے آسمان کو گھور رہے تھے ——— میں حیران تھی آخر یہ اس سردی
میں کیوں باہر برآمدے میں بیٹھے تھے ——— نہ جانے کیوں میں
انہیں دیکھکر مسکرا دی تھی ——— مگر ——— وہ مجھے حیرت سے
دیکھ رہے تھے ——— نہیں گھور رہے تھے۔ پھر اپنے ہونٹ دانتوں
سے دبانے لگے تھے ——— میرے دل میں کسک سی ہونے لگی

تھی ـــــ جیسے کسی نے میری بہت ہی قیمتی چیز چرا لی ـــــ جیسے کسی بہت ہی بڑے صدمے سے میں بے قرار سی ہو گئی ۔۔۔۔ مگر وہ پھر اس گھٹا آلود آسمان کو گھورنے لگے تھے ـــــ میں آہستہ آہستہ برآمدے سے اپنے کمرے میں گھس گئی ـــــ جہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا ـــــ میں نے ٹٹول ٹٹول کر سوئچ دبایا ـــــ ایسی روشنی ہوئی، ہلکی زرد زرد سی سنہری روشنی کمرے میں جھلملا رہی تھی۔ مدھم زرد سی روشنی۔ دل گھبرانے لگا تھا۔ میں نے کھڑکی کھولی تو باہر گھٹاؤں سے گھرا ہوا آسمان رو رہا تھا۔ کتنی افسردہ تھی وہ شام ـــــ صہیب کتنے اداس تھے۔ نہ جانے انہیں میں آج تک نہ سمجھ سکی۔ کبھی کبھی وہ میرے کتنے قریب ہو جاتے ہیں ـــــ اور کبھی کبھی کتنے دور ـــــ جیسے وہ مجھے پہچانتے بھی نہیں۔ مگر مصر جاتے ہوئے میری میز پر رکھی ہوئی میری تصویر بھی اچکا کر لے گئے تھے۔ اور میں خاموشی سے سارے گھر میں ڈھونڈھ کر بیٹھ گئی تھی۔ مگر ڈر کے مارے امی جانی سے بھی نہ کہہ سکی تھی۔ وہ تو کل جہانوں باجی کی الماری سے ایک بندھے ہوئے پلندے کو میں یونہی کھول بیٹھی تھی جو صہیب کے خط تھے جو جہانوں باجی کے نام تھے اور باجی نے وہ ۔۔۔ احتیاط سے چھپا کر رکھے تھے۔ ان خطوط کو پڑھ کر معلوم ہوا صہیب کے فقرے ابھی تک میرے کانوں

میں گونج رہے ہیں۔ جہانو اس کی دلیل میں ثروت کی تصویر سے آیا ہوں۔ تمہاری نہیں لایا۔ کیونکہ میں سلمان کی زندگی کو دکھ نہیں پہنچانا چاہتا ——— ثروت کی تصویر لے آیا ——— سب کچھ وہی ہے جو تم میں ہے۔ صرف اس کی پلکیں کسی کے بار سے جھکی ہیں۔ وہ میں نے پینسل سے موڑ دی ہیں ——— ثروت کی مسکراہٹ میں ابھی کسی کی زندگی نہیں چھپی۔ مگر تمہارے لبوں کی مسکراہٹ نے میری زندگی چھین لی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ ہزار ڈھونڈھتا ہوں ان ہونٹوں کی مسکراہٹ میں اپنی تڑپتی ہوئی زندگی کو ——— مگر ——— وہاں پھیکی سی مسکراہٹ کے سوا اب کچھ بھی تو نہیں ملتا جہانو“ ——— اور مجھے خالہ جانی کے الفاظ یاد آ گئے تھے۔ کہ ثروت تو بنی بنائی جہانو ہے ——— کتنا عجیب ہے صہیب۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ وہ جہانو باجی کی شادی کے بعد جب میں نے تصویر دی تھی صہیب بھیا کو اور باجی کے الفاظ دہرائے تھے تو وہ پاگلوں کی طرح سے میرے چہرے کو گھور رہا تھا۔ اور میں کتنی نروس ہو گئی تھی ——— اس کے بعد میں نے صہیب کو کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا ——— مگر اس دن وہ پہلی بار مسکرایا تھا ——— جب جہانو باجی علیگڈھ سے واپس آئی تھیں ——— اپنی سسرال سے ——— مگر جب جہانو باجی نے ان سے پوچھا تھا ——— صہیب بھیا

کیسے ہیں آپ۔ تو وہ اس شام کی طرح، ویسے ہی اداس مرجھاسے گئے تھے ——— وہ جھلملاتی ہوئی ——— آنکھیں آسمان کو نہیں گھور رہی تھیں ——— بلکہ جہانو کی سفید سی ناک میں چمکتی ہوئی ہیرے کی کیل کو گھور رہی تھیں ——— جیسے ——— کیسے ہیں آپ۔ کا جواب، اس کیل سے کہہ رہے ہوں کہ جواب کیوں نہیں دیتی ———

اور جہانو باجی زرد پڑ گئی تھیں ——— کمر پہ پڑی ہوئی بل دار سیاہ چوٹی جیسے تڑپ گئی تھی ——— سیاہ بالوں میں چمکتی ہوئی سفید باریک سی مانگ جو سفید باریک دوپٹے کا بوجھ نہ سہار سکی اور جلدی سے پھینکدیا تھا ——— گھنی گھنی سیاہ مڑی ہوئی پلکیں ایک ساتھ زمین پر جھک گئی تھیں ——— اور گورے گورے ہاتھ کانپ گئے تھے جو اس وقت بادامی سے ریشمی برقعے کے بٹن نہ کھول سکے تھے ——— اس وقت جب باجی سسرال سے آتے ہی امی جانی کے سینے سے لگی رو رہی تھیں ——— اور میں خوشی سے چیخ اٹھی تھی ——— جہانو باجی آپ کب آئیں ——— اور سلمان بھیا نہیں آئے آپ اکیلی آئی ہیں؟

وہ امی جانی کو چھوڑ کر میری طرف پھیکی سی مسکراہٹ بکھیرتی ہوئی ——— [illegible] ——— ہاں ثروت سلمان کو کام بہت تھا کئی مقدمے تھے اس لئے نہیں آئے میرا دل گھبرایا اور میں اکیلی ہی آ گئی —— کیوں؟

بہوت تم کیسی ہو؟ ـــــ اور وہ میرے چہرے کو غور سے دیکھ رہی تھیں

ـــــ جیسے پوچھ رہی تھیں کیوں تمہارا دل گھبراتا ہے ـــــ اور وہ

سفید مٹے سے رومال سے اپنی گھنی گھنی مڑی ہوئی چمکدار پلکوں میں

ٹھہرے ہوئے آنسو پوچھ رہی تھیں کہ اتنے میں صہیب بھیا۔ ململ کا

سفید کرتا پہنے کمرے میں گھس آئے تھے ـــــ اور ـــــ

جہانوں باجی کے ایک ہاتھ میں برقعے کا اوپر کا حصہ تھا ـــــ وہ

سر سے گر پڑا ـــــ زمین پر ـــــ ارے میں نے جھک

کر ان کو برقعہ کا اوپر کا حصّہ دیا ـــــ تو دوسرے ہاتھ سے چھوٹا سا

اٹیچی کیس چھوٹ گیا۔ اور گرتے ہی ـــــ کھل بھی گیا۔ جس میں سے

کچھ چیزیں گر پڑیں ـــــ ارے جہانو باجی ـــــ میں حیرت سے

انہیں دیکھ رہی تھی ـــــ وہ صہیب بھیا کی طرف۔ اور صہیب بھیا

کرتے کا بٹن پکڑے ہوئے۔ گرے ہوئے اٹیچی کیس کو گھور رہے تھے

جیسے کہہ رہے تھے ـــــ یہ میرا قصور نہیں۔ میرا قصور نہیں ـــــ

امی جانی ـــــ کمرے سے جا چکی تھیں ـــــ میں آہستہ آہستہ

چیزیں اٹھا رہی تھی۔ کوئی پاؤڈر کا ڈبہ کتنا پیارا سا جس پہ پھول ہی پھول

بنے ہوئے تھے ـــــ چھوٹا سا پرس۔ رائٹنگ پیڈ۔ لپسٹک اور نیلے

نیلے لفافے۔ جو گر کر بکھر گئے تھے ـــــ میں جلدی جلدی لفافے اٹھانے

لگی —— ایک کھلے ہوئے لفافے میں سے سر سے دو تصویریں گر پڑیں ——
ارے —— صہیب بھیّا —— کی —— تصویر، اور —— اور
جہانوں باجی لپک کر مجھ پر جھک گئیں —— اب پھر وہ لفافے
گھبراہٹ میں مجھ سے چھین کر صہیب کو دے رہی تھیں —— مگر
جب سیاہ مڑی ہوئی گھنی چمکدار پلکیں —— اُداس سی نظروں کیطرف
مڑیں تو، خوبصورت آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے —— اور ہونٹ
بھینچے ہوئے تھے۔ جیسے کہہ رہے ہوں —— بس اب نہ ستاؤ، ——
جہانو باجی خود بھی مرجھا سی گئی تھیں —— میری طرف دیکھ کر صرف
پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پر بکھیرتے ہوئے بولیں، لو میں بھی کس قدر
پاگل ہوں۔ اپنے لفافے صہیب بھیا کو دے رہی تھی ——
صہیب بھیّا میں جیسے اس وقت جان آگئی تھی —— وہ بٹن کو
بدستور موڑتے ہوئے پھیکی سی مسکراہٹ لئے آہستہ سے میری طرف
دیکھ کر بولے —— اوہ کتنی پاگل ہے۔ جہانوں مجھے اور اپنی
چیزیں دے رہی ہے۔ اور اب . . . جب ان کا مالک بھی موجود
ہے۔ اب تم مجھے کیا دو گی۔ کافی چیزیں تم نے دیدی ہیں —— اب
مجھے کچھ نہیں چاہیئے —— وہ میری طرف پھر گھورنے لگے تھے ——
جیسے کہہ رہے ہوں —— تم سب باتیں پوچھنا چاہتی ہو —— میا

کبھی نہیں بتاؤں گا' اس ہیرے کی چمکتی ہوئی کیل سے پوچھو ـــــ
وہ جہانوں باجی کو گھورنے لگتے تھے ـــــ تم کیسی ہو ـــــ غریب
جہانوں باجی سے اپنے برقعہ کے بٹن بھی نہیں کھل سکے تھے ـــــ
گورے گورے ہاتھ کیسے کانپ رہے تھے۔ سفید پیشانی پر اس
سردی میں پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ مڑی ہوئی گھنی چمکدار
پلکوں پر رکے ہوئے آنسو رخساروں پر ڈھلک گئے تھے ـــ جیسے
کہہ رہے تھے یہ ہے میرا حال ـــــ ان کے ہونٹ کانپنے لگے
تھے ـــ مگر وہ کچھ نہ کہہ سکیں تھیں۔ وہ خوف سے میری طرف دیکھ
رہی تھیں جیسے میں یہ سب باتیں امی جانی سے کہدوں گی ـــــ
مگر میرے دل میں نہ جانے ان دونوں کی کیوں اتنی محبت ہے ـــــ
اس وقت اگر میرا بس چلتا تو ـــــ سلمان کا گلا گھونٹ دیتی ـــــ
اور صہیب بھیا اور جہانوں کی دونوں کی شادی کر دیتی ـــــ مگر
نہ جانے کیوں امی جانی نے جہانوں باجی سے نہ کر دی ـــ دونوں
کی شادی۔ ـــ میں یہی سوچتی رہتی ہوں ـــــ جب مجھے
اتنا ہوش ہی نہیں تھا ـــــ کتنی بدھو تھی میں اس زمانے میں ـــ
سوائے کھیلنے کودنے کے اور زندگی کسی میں نظر ہی نہیں آتی تھی ـــ
اب جب آنکھیں کھلیں تو کیا ہوتا ہے۔ جب میں امی جانی سے پوچھتی

کہ آپ نے جہانوں باجی کی شادی کیوں صہیب بھیا سے نہ کر دی ــــ تو وہ مجھے سر سے پاؤں تک حیرت سے دیکھتیں۔ اور سر کھجاتے ہوئے ــــــ ناک چڑا کر کہتی ــــــ تجھے ان باتوں سے کیا غرض ــــ جاؤ جاکر اپنے بابا کے کمرے کی گھنٹی بجاؤ کھانے کا وقت ہو گیا۔ مگر وہ ابھی دفتر میں ہی بیٹھے ہیں۔ اور میں جب اپنے سوال کا یہ جواب سنتی تو بس غصہ ہی آجاتا ــــــــــــ

اس روز کھانے کی میز پر میری پلیٹ میں آلو ڈال رہی تھیں تو انہوں نے گھورتے ہوئے مجھ سے سوال کیا تھا۔ تم صہیب کے کمرے میں اتنا کیوں جاتی ہو جی ــــــ کیا اس نے تم سے کچھ کہا تھا ــــ شادی کے بارے میں ــــــ وہ پھر بابا جان کی طرف دیکھنے لگی تھیں ــــــ جو اپنے پلیٹ پر جھکے ہوئے ــــــ کانٹے کی مدد سے آلو سوس میں ملا کر کھا رہے تھے ــــــ مگر مجھے ایسا اس وقت محسوس ہوا تھا جیسے ابلے ہوئے آلو حلق میں پھنس رہے تھے، مگر میں ہونٹوں میں آگئی تھی ــــــ نہیں تو میں تو ایسے ہی کہہ رہی تھی، کتنا اچھا ہوتا ــــــ صہیب بھیا اچھے ہیں سلمان بھیا سے ــــــ میں لاڈ کے لہجے میں بولی ــــــ کانٹے سے آلو اٹھاتے ہوئے میں نے دیکھا تو امی جانی اور بابا جان مجھے گھور رہے تھے ــــــ جیسے

کہہ رہے ہوں کہ اچھا بیٹی! ——— یہ بات ہے ——— شاید تمہیں بھی صہیب پسند آ گئے ——— ٹھہرو ہم تم سے ہی کر دیتے ہیں ان کی شادی ——— اور میں شرما سی گئی ہاتھ کانپنے لگے۔ سفید ٹیبل کلاتھ پر کانٹے سے آلو نکل کر دور جا پڑا۔ ٹماٹر کی چٹنی میں بھیگا ہوا آلو ——— سفید ٹیبل کلاتھ پر گرتے ہی اپنے چاروں طرف چھپئی سا گھیرا بنانے لگا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے سفید بلاٹنگ میں سیاہی خود بخود ہی رستی جاتی ہے۔ اور سیاہی کا دھبہ بڑھتا ہی جاتا ہے آہستہ آہستہ سرکتا ہوا سا ——— ایسے ہی آلو کے چاروں طرف چھپئی سے رنگ کا دائرہ بڑھتا ہی جاتا تھا ——— کمبخت زندگی میں پہلی بار آلو اس روز مجھے بُرا لگا تھا۔ ———

کتنی بدتہذیب ہو گئی ہو تم ثروت!

امی جانی کبھی آلو کو، اس کے بڑھتے ہوئے نارنجی سے دائرے کو کبھی مجھے کبھی بابا جان کو گھور رہی تھیں ——— اور میرا جی چاہا کہ سالب آلو اور ٹماٹر کی چٹنی جو مجھے بے حد پسند تھی ——— پلیٹ میں سے نکال کر امی کے سامنے میز کے نیچے رکھی ہوئی ٹوکری میں ڈال دوں، مگر امی جان کی نظروں کی تاب نہ لا کر میں ہل بھی نہ سکی تھی ——— ان دلوں میں امی جان سے کتنا ڈرتی تھی۔ توبہ ہے ——— اب ———

ہُنہ اب تو کبھی بھی نہ ڈروں ـــــ اب بڑی جو ہو گئی ہوں ـــــ
خیر سے اب تو امی جانی بغیر مجھے ساتھ لئے شوپنگ کرنے بھی نہیں
جاتی ہیں ـــــ خدا کی شان ہے وہی ہم ہیں ـــــ بدتہذیب اور
وہی امی جانی ـــــ مگر جہانوں باجی ـــــ ایک خوشی تو مجھے
بھی ہوئی تھی ان کی شادی سے ـــــ کہ ـــــ ساری ان کی
چیزیں مجھے مل گئی تھیں ـــــ ان کا سجا سجایا آرٹسٹک سا کمرہ ـــ
صہیب بھیا کے کمرے کی طرح کا بالکل ـــــ جیسے ایک ہی شخص
نے دو کمرے اپنی پسند سے آراستہ کئے ہوں۔ مجھے خوشی تھی ـــ
کہ میں بھی ان دونوں کی طرح ہم ذوق ہوں ـــــ وہی الماری مگر
ان پر پڑے ہوئے پردوں پر گرد نہیں۔ گہرے نیلے سے کیونکہ باجی کی
طرح میں بھی روز صبح اٹھ کر اپنا کمرہ صاف کرتی ہوں۔ ایسا ہی نرم سا
بستر نیلے بیڈ کور سے چھپا ہوا مگر سلوٹیں ذرا بھی نہیں ہیں۔ ایک چھوٹی
سی کتابوں کی الماری۔ جس میں غالب، ذوق، اقبال، جوش، اصغر، فانی،
حافظ کے دیوان شیلے، شیکسپیئر، گوئٹے کی زندگی موٹی موٹی جلدوں میں بند،
کرشن چندر کا شکست ناول ـــــ اُف کس قدر رنگین اور رسیلے
ہوئے جذبات ہیں۔ پڑھتے پڑھتے میں بے اختیار رو پڑی تھی ـــــ
اور گھبرا کر میں نے اپنے کمرے میں چونک کر دیکھا تھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا

یہ کیوں رو رہی ہے۔ مگر ہوا سے نیلے پردے مچل رہے تھے۔ کمرے میں کوئی بھی نہ تھا ــــــ میں اکیلی ہی تھی ــــــ میں کتنا روئی تھی، ہچکیاں بندھ گئی تھیں ــــــ مینٹل پیس پر میری نگاہیں خود بخود ہی پہنچ گئی تھیں ــــــ جہانوں باجی کی اداس پھیکی سی مسکراہٹ نے میرے ترسے ہوئے آنسوؤں کو بہا دیا تھا ــــــ آہ ان کی وہ گھنی گھنی بڑھی ہوئی پلکیں ــــــ جن کے سایوں میں صہیب کی زندگی کروٹیں بدل رہی تھی ــــــ مگر پلکوں کے بوجھ سے اٹھ نہ سکتی تھی ــــــ میری ناشاد باجی ــــــ کتنا ضبط تھا ان میں ــــــ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا ــــــ میں ان کی مسکراتی ہوئی تصویر کو کھینچ لائی تھی اپنے دل کے قریب ــــــ نہ جانے کب تک روتی رہی تھی ــــــ مگر اف اس روز کیسا محسوس ہوا تھا۔ جیسے جہانو باجی میرے سینے سے چمٹی ہوئی خود بھی سسکیاں بھر رہی تھیں ــــــ میرے جسم پر ایک بوجھ سا ہو گیا تھا۔ ان کے جسم کی بھینی بھینی خوشبو۔ میری ناک میں تیزی سے گھس رہی تھی ــــــ میرے گرم گرم آنسو ٹھنڈے پڑ گئے تھے اور جیسے ان کے گرم گرم جلتے ہوئے آنسو میری پلکوں سے ٹکرا گئے تھے۔ میں کتنا ڈری تھی اس دوپہر کو ــــــ میں یہ نہ محسوس کر سکی تھی کہ میں جاگ رہی تھی یا سو رہی تھی ــــــ صرف اتنا سہہ سکی جیسے ــــــ جہانوں باجی کے ہونٹ

ہل رہے تھے ـــــ کہہ رہی تھیں.... ثروت پیاری ـــــ یہ
میرا آخری کام کر دینا ـــــ میری روح تمہارا احسان اُس دنیا میں
بھی نہ بھولے گی ـــــ کھڑکی سے ٹھنڈے ٹھنڈے ہوا کے جھونکے
میرے رخسار کو چوم رہے تھے جسکی ٹھنڈک سے میرا دل اور بھی ٹھنڈا
پڑتا جا رہا تھا۔ ایسے ہی اس روز میں نے غالب کا دیوان ذرا پڑھنے
کی غرض سے کھولا کہ ـــ کیا اتنے مشکل شعر ہیں غالب کے جو باجی
صہیب بھیا سے سمجھنے کے لئے ہر روز ان کے کمرے میں جاتی تھی۔
اور ان سے شعروں کا مطلب پوچھتی تھی ہزاروں اشعار پر ٹک لگے
ہوئے تھے۔ کسی شعر پر 'ایس' اور کسی پر 'جے' بنے ہوئے تھے۔ کہیں
کہیں پانی کے قطروں کے نشان بھی تھے ۔ پیلے پیلے دائرے سے۔
شاید آنسو ہوں ـــــ اس شعر پر میں چونک پڑی ـــــ کتنے
ہی قطرے گرے تھے اس شعر پر جیسے زرد رنگ ہو گیا تھا۔ اتنی جگہ
کا ـــــ یہی غالب کا مشہور شعر ـــــ

”ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے“

وہاں 'ایس' لکھا ہوا تھا ـــــ اس کے نیچے ایک اور بحر شروع
ہو گئی تھی۔ وہاں ایک شعر کے بالکل قریب ہی 'جے' لکھا ہوا تھا وہی
مشہور شعر ہے

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن،
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

مگر جیسے کسی نے 'بے، کاٹ کراس، بنا دیا تھا۔ زبردستی کسی کے ہاتھ سے پنسل لے کر۔ جہانوں باجی کی مینٹل پیس کے بیچ میں —— جہاں ان کی کئی سہیلیوں کی تصویریں بھی رکھی ہیں۔ ایک تصویر بیچ میں بڑی سی رکھی ہوئی ہے۔ جہانوں باجی نے بڑی محنت سے بنائی تھی —— خود۔ اور مجھے شادی کے دوسرے دن جاتے ہوئے کہا تھا —— ثروت جہان —— ایک کام میرا کر دینا —— یہ تصویر میں نے بڑی محنت سے بنائی ہے۔ صہیب بھیا نے مجھے پڑھایا ہے اور تصویریں بنانی بھی سکھائی ہیں۔ ان کو یہ تحفہ دینا چاہتی تھی —— مگر وہ تو تین روز سے نظر ہی نہیں آئے اب میرے پاس وقت بھی نہیں۔ تم دیدینا۔ اور میں نے خوش ہوتے ہوئے لے لیا تھا —— ہاں ہاں باجی میں ضرور دیدوں گی —— وہ ڈری ہوئی سیاہ چمکیلی پلکوں سے تصویر کو گھورنے لگیں۔ مجھے ایسی خوشی ہو رہی تھی جیسے میں باجی کی مصیبت میں کام آ رہی ہوں۔ وہ رُک رُک کر کہہ رہی تھیں —— کہنا صہیب سے —— تم بہت جلد چلے گئے —— مجھ سے ملے بھی نہیں —— امی جانی سے معلوم ہوا کہ وہ مصر جا رہے ہیں

آرٹ کا بج ہیں مسکرانے لگیں پھیکی سی مسکراہٹ جیسے انکی مسکراہٹ کے پیچھے ہزاروں رنج وغم کلبلا رہے ہیں۔ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ وہی سرخ دوپٹہ ان کے کاندھے پر سے ڈھلک گیا تھا۔ سفید لمبی سی گردن میں نیلی نیلی رگیں ہلکے ہلکے تڑپ رہی تھیں جیسے بہت کچھ وہ ضبط کرتے کرتے تھک سی رہی ہوں، سنہرے زیوروں میں سے جھانکتا ہوا سرخ و سفید چہرہ سیاہ پیچدار لٹوں میں گھری ہوئی چمکدار پیشانی ——— اور ہائے وہ بڑھی ہوئی سیاہ نوکیلی پلکیں نیند میں ڈوبی ہوئی لبریز چمکدار بھرنوں پر سائے کئے ہوئے سی تھیں ——— کانپ سی رہی تھیں۔ ہوا کے خوف سے نہیں۔ اس خوف سے کہ سرمئی لکیر کہیں چمکیلے پانی کی موجوں سے مٹ نہ جائے اور آنسو چھلک نہ پڑیں ——— وہ ان کے کمرے کی طرف گھور رہی تھیں۔ نہ جانے کس وقت آتے ہیں . . . . میں نے تو پرسوں سے نہیں دیکھا ——— وہ بت کی طرح سے بیٹھی تھیں، جیسے ان کی روح کب کی میرے کمرے سے نکل کر صہیب بھیا کے کمرے میں پہنچ گئی ہو ——— ان کا چہرہ سفید سا ہو گیا تھا ——— مڑی ہوئی پلکیں بکھر سی گئی تھیں، اور جھرنے جیسے سوکھ سے گئے تھے۔ ان کا چمکیلا پانی۔ سیاہ دائرے میں تڑپنے لگا تھا۔ پھٹی پھٹی نظروں سے وہ مسلسل گھورے جا رہی تھیں صہیب کے کمرے کو۔ مگر وہاں چق پڑی ہوئی تھی۔ باریک

باریک تیلیوں والی۔ سرخ سبز سے رنگوں سے رنگی ہوئی ـــــ اور کچھ بھی نہ تھا ـــــ وہ ایک دم ہوش میں آگئی تھیں شروت ـــــ وہ ایک بار ضرور آئیں گے ـــــ تم ان سے کہنا میں آج سے ٹھیک پندرہ دن بعد آؤں گی۔ وہ جب تک یہاں ہی ٹھہریں۔ اس کے بعد وہ جا سکتے ہیں ـــــ کہنا۔ یہ میرا۔ آخری حکم ہے ـــــ آخری ـــــ انہوں نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے تھے ـــــ سرخ دوپٹے کے پلو میں لگی ہوئی سنہری لمبی لمبی نازک سی کرن۔ وہ کب سے مروڑ مروڑ کر نوچ رہی تھیں ـــــ جیسے اس کے نوچنے سے لوگوں کو محسوس ہو جائے کہ وہ شادی کا جوڑا پہننا پسند نہیں کرتیں۔ مگر سمجھنے والوں کو اتنا وقت کہاں کہ وہ میز پر پڑے پڑے سنہرے باریک سے تاروں کو غور سے دیکھ کر محسوس کر سکیں کہ یہ کیوں نوچے گئے ہیں ـــــ وہاں تو سب یہ دیکھتے ہیں کہ۔ داڑھی والے مولویوں نے لڑکی سے ہاں بھی کرا لی یا نہیں۔ اور شادی کے بعد۔ لڑکی پہنے اوڑھے رہے تو سمجھو کہ خوش ہے ـــــ چہرے کی تازگی اور پژمردگی کو کون دیکھتا ہے۔ ـــــ برقعہ پہنتے ہوئے انہوں نے مجھے بھی سینے سے لگا لیا تھا ـــــ اس روز وہ خوب جی بھر کے روئی تھیں ـــــ خوشبوؤں میں بسا ہوا جسم ـــــ کتنا تیز ان کا دل دھڑک رہا تھا ـــــ کہ برقعہ کے بٹن بھی ہل رہے تھے ـــــ

موٹر میں سوار ہوتے ہوئے انہوں نے میری پیشانی چوم لی تھی، اور آہستہ سے کہا تھا ـــــ ثروت میرے کمرے میں تم ہی رہنا۔ مگر کتابوں کو نہ کھولنا۔ کسی چیز کو نہ چھیڑنا ـــــ میرے پہننے اوڑھنے کی چیزیں جو تمہیں پسند ہوں تم بخوشی استعمال کرنا ـــــ اور ہاں صہیب جو چاہیں، وہ لے سکتے ہیں۔ ان کو میرے کمرے میں آنے دینا ـــــ اور نہ جانے وہ کیا کہنا چاہتی تھی جو سلمان بھیا کے آتے ہی وہ ہچکچا کر رہ گئی ـــــ اور نقاب ڈال کر موٹر میں بیٹھ گئی تھیں ـــــ

مجھے یاد ہیں اب بھی وہ دن۔ شادی سے پہلے کے اور شادی کے بعد بھی ـــــ جب وہ علیگڑھ یعنی اپنی سسرال سے واپس آئی تھیں۔ ٹھیک پندرہ دن بعد ـــــ اور اس رات صہیب بھیا بھی مصر چلے گئے تھے۔ نہ جانے کب سے یہ پروگرام بنا رکھا ہوگا۔ پانچ سال کا کورس تھا۔ آج پورے پانچ سال اور پندرہ دن ہو چکے ہیں۔ کل وہ آئیں گے ـــــ اور آج جہانوں باجی کو اس دنیا سے گئے ہوئے پورے پندرہ دن ہوتے ہیں ـــــ خط ملتے ہی میں نے آج پورے پانچ سال پندرہ دن بعد یہ کمرہ کھولا ہے ـــــ صہیب بھیا آ رہے ہیں، آرٹسٹ بنکر ـــــ ان کا کمرہ صاف کرنا ہے ـــــ آج جہانوں باجی ہوتیں تو کتنی خوش ہوتیں ـــــ صہیب آ رہے ہیں ـــــ

وہ صہیب جن کو دیکھنے کے لئے۔ صرف ایک بار دیکھنے کے لئے باجی نے
تین سال کے بجائے گھسٹ گھسٹ کر اسی انتظار میں اپنی جان دیدی
دو سال انتظار میں جیتی رہیں کہ پانچ سال بعد صہیب آئیں گے ـــــ
مگر افسوس پندرہ دن پہلے ختم ہوگئیں ـــــ ڈاکٹروں نے تو دو سال
پہلے ہی جواب دیدیا تھا۔ مگر انتظار کئے دو سال گھسیٹے ـــــ میرے
کمرے میں مرنے سے پہلے۔ کچھ روز پہلے جب سب کہتے تھے کہ دق
کا مریض سنبھالا لیتا ہے۔ مگر باجی نے اس سنبھالے میں بھی ایک آخری
تحفہ صہیب کے لئے تیار کیا ـــــ کتنی محنت کی تھی اس تصویر پر۔
امی جان ـــــ روتے روتے کہتی تھیں، کہ جہانوں اب تمہاری
طبیعت پہلے سے بہتر ہے۔ تم آرام کرو۔ اور وہ پھیکی سی مسکراہٹ سے
انہیں دیکھنے لگتیں ـــــ جس کی تاب نہ لاکر امی جان آنسو پونچھتے
ہوئے منہ پھیر لیتیں ـــــ جیسے وہ سمجھ جائیں ـــــ اور باجی آنکھوں
ہی آنکھوں میں کہہ جاتیں۔ امی تم نے آرام کرنے کے لئے مجھے راستہ
بتا دیا۔ اب کیوں فکر کرتی ہو ـــــ میں آرام سے سو جاؤں گی ـــــ
مگر وہ سوچتے سوچتے گھبرا کر کھانستے ہوئے کہہ جاتیں۔ نہیں امی میں
تصویر بنا رہی ہوں۔ دل گھبرانے لگا ہے اب تو لیٹے لیٹے ـــــ میں
کانپ جاتی تھی ان کے اس لفظ پر۔ دل گھبرانے لگا ہے۔ اسی دل نے

توگھبرا کر اس دنیا کے جانے کا راستہ سمجھا دیا ہے ـــــ اُف اپیاری سی باجی ـــــ انہوں نے مرنے سے ایک دن پہلے تصویر پینٹ کر لی تھی ایسی ہی اداس سی شام کو . . . . . جب میں ٹہاکر ان کے کمرے میں گئی تھی ـــــ تو وہ اس اندھیرے کمرے میں تصویر کو سینے پر رکھے کھڑکی سے اُداس سی شام میں کھوئی ہوئی سی تھیں۔ زرد زرد سے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے ـــــ کتنی دبلی ہو گئی تھیں ـــــ شام کے دھندلکے میں سفید بستر پر ایک ڈھانچا سا پڑا ہوا تھا ـــــ مڑی ہوئی پلکیں نہ جانے کیوں ہر وقت بھیگی بھیگی رہتی تھیں۔ اُف کس قدر چمکدار ہو گئی تھیں ان کی آنکھیں ـــــ میں زور سے کھانسی تو وہ چونک پڑیں ـــــ پھیکی سی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے۔ آہستہ سے بولیں۔ ثروت! ـــــ وہ کیسی اداس اداس نظروں سے مجھے گھور رہی تھیں ـــــ میرا دل اندر سے تڑپ گیا ـــــ میرا جی چاہا کہ چیخیں مار مار کر رونے لگوں اور شاید باجی بھی سمجھ گئی تھیں۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے اپنے بازو پھیلا دیئے تھے اور میں نے ان کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا تھا ـــــ ان کے گول گول نرم ہاتھ اب کتنے سخت ہو گئے تھے۔ لمبے لمبے ـــــ وہ کس محبت سے میرے گرم گرم رخسار پر پھیر رہی تھیں ـــــ میں ڈر ڈر کے رو رہی تھی ـــــ کہ باجی کو محسوس

نہ ہو ـــــــ مگر شاید مرنے والے کو ساری چیزوں کا علم ہو جاتا ـــــــ انہوں نے میرے ہلکے سے چپت لگاتے ہوئے کھانسی کو روکتے ہوئے کہا تھا ـــــــ ثروت جان ـــــــ تم روتی کیوں ہو ـــــــ خوش ہونا چاہئے کہ تمہاری باجی اب جلد ہی آزاد ہونے والی ہے۔ اس ذہنی بوجھ سے جس سے وہ دبلی جا رہی تھیں ـــــــ پیاری بچی . . . خدا نہ کرے کہ تم اپنی ہونٹوں کی مسکراہٹ کسی کو دو ـــــــ پھر تم عمر بھر صرف ایک بار ہنسنے کے لئے نہیں مسکرانے تک کو ترس جاؤ گی۔ خدا نہ کرے ـــــــ میں اس وقت میری جان ـــــــ میری طبیعت زیادہ خراب ہے ـــــــ میرا وقت قریب ہے۔ مجھے معاف کرنا۔ شاید میں نے تمہیں کبھی ڈانٹ دیا ہو۔ اس وقت تم میری چھوٹی بہن نہیں ـــــــ

ـــــــ بلکہ ایک ہمدرد دوست ہو ـــــــ میری ثروت اس کھڑکی کو بند کر دو ـــــــ دیکھو تو آج کی شام کتنی سوگوار ہے ـــــــ غم سے نڈھال ـــــــ کھڑکی بند کر دو ـــــــ وہ پاگلوں کی طرح کھڑکی سے باہر گھور رہی تھیں ـــــــ کتنا تیز سانس چل رہا تھا۔ ـــــــ دل کی دھڑکن کتنی تیز تھی ـــــــ کھلے ہوئے بالوں کی

سیاہ لٹیں سینے پر پڑی ہوئی دل کی ہر حرکت سے تڑپ جاتی تھیں
..... میں نے کھڑکی بند کر دی تو کتنا خوفناک قسم کا اندھیرا ہو گیا تھا
سفید بستر پر پڑی ہوئی باجی سچ مچ کا مردہ معلوم ہو رہی تھیں مگر اس اندھیرے
میں ان کی آنکھیں کیسی چمک رہی تھیں ــــــ میں نے اپنے ڈر کو چھپاتے
ہوئے کہا تھا باجی ــــــ آپ کہیں تو بجلی جلا دوں بہت اندھیرا ہو رہا
ہے۔ رات ہو گئی اب تو ــــــ وہ کھانستے ہوئے بولیں۔ بس تھوڑی
سی دیر اور ــ ہے میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ پھر امی بھی نماز
پڑھ کر آ جائیں گی اور غریب سلمان بھی ڈاکٹر کو لے کر آتے ہوں گے۔
ایسا ہی ہے تو شمع روشن کر دو ــــــ وہ شام میں کبھی نہ بھولوں گی
ــــــ سفید نرم تکئے میں دھنسا ہوا باجی کا سر۔ شمع کی زرد تھرتھراتی
ہوئی ہلکی سی روشنی میں باجی کا زرد چہرہ، وہ چمکتی ہوئی آنکھیں۔ جیسے
کٹے ہوئے موتی۔ لبریز پیالے۔ ڈگر ڈگر کرتی ہوئی آنکھیں وہ مڑی ہوئی
آنسوؤں سے بھیگی ہوئی پلکیں۔ انہوں نے سینے سے تصویر اٹھا کر دکھاتے
ہوئے کہا۔ ثروت یہ تصویر پوری ہو گئی ــــ کل رات کو میں نے پینٹ
کر لی۔ مجھے کتنا تعجب ہوا تھا۔ ارے باجی آپ رات کو بھی جاگتی ہیں۔
ہاں! وہ کچھ سوچ کر بولیں۔ پھر آہستہ آہستہ کھانستے ہوئے شمع کو
گھورنے لگیں۔ ثروت یہی شمع تو میں رات کو جلایا کرتی تھی۔ جلتے جلتے

اسمیں کتنا گہرا گڑھا ہو گیا ۔ پگھل پگھل کر ــــــ نہ جانے اس شمع کے بارے میں وہ کیا سوچتی سوچتی گھبرا گئیں تھیں اور کتنا گرم سانس تھا ان کا جس سے شمع بھی کانپ گئی تھی ۔ مگر بھڑک کر پھر کانپتے ہوئے جلنے لگی تھی ــــــ ان کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے ۔ تصویر ہاتھ میں کانپ رہی تھی ۔ کتنی گہری گہری نظروں سے وہ تصویر کو دیکھ رہی تھیں ــــــ ذرا مجھے قلم اٹھا دو ۔ وہ چونک پڑی تھیں جیسے کوئی بات یاد آ گئی تھی ــــــ وہ پھر شمع کو گھورنے لگی تھیں ــــــ

میں سلمان بھیا کی میز پر سے قلم لے کر واپس کمرے میں آئی تو باجی اپنا منہ تکیہ پر رکھے ۔ اوندھی لیٹی تھیں لمبی لمبی زرد باہیں تکیہ کے گرد پھیلی ہوئی تھیں ۔ لمبے لمبے سیاہ بال ان کی کمر پر بکھرے ہوئے تھے ــــــ اور زرد سی شمع سسکیاں بھر رہی تھی ــــــ کمرے میں کتنی اُداسی تھی ــــــ میرے قدم کانپنے لگے تھے ــــــ صہیب بھیا کے کمرے کی یہ تصویر مجھے یاد آ گئی تھی ــــــ

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی

اک شمع رہ گئی تھی سو وہ . . . . .

آگے میں نہ سوچ سکی مگر میرے کانوں میں جیسے کوئی زور زور سے کہہ رہا تھا، سو وہ بھی خموش ہے ــــــ مگر میں ہر بار جھنجلا کر کہتی تھی ــــــ

نہیں ــــــ خدا نہ کرے ـــــــــــ آنے والے وقت کے
خیال سے دل بیچین ہو گیا تھا ـــــ آنسو نکل پڑے تھے ـــــ
باجی میں نے ان کے سوکھے ہوئے ہاتھ کو ہلایا ــــــ اُف
کس قدر پھپک رہی تھیں ـــــ لے آئیں۔ وہ سیدھی لیٹ گئیں
اپنی سفید ساڑھی سے بھیگا ہوا منہ پونچھتی ہوئی ــــــ کتنی سُرخ
ہو گئی تھیں ان کی آنکھیں جیسے شعلے دھک رہے تھے۔ چمکیلے
سفید پردے کے پیچھے ـــــ کانپتے ہاتھوں سے انہوں نے پین
میرے ہاتھ سے لے لیا۔ سلمان۔ وہ پین کو غور سے دیکھ رہی تھیں
یہ سلمان کا پین ہے۔ ان کے پن سے میں آخری دفعہ لکھ رہی ہوں ـــــ
صہیب کے تحفہ پر ـــــ کتنا ظلم ہے غریب سلمان پر۔ بیچارے ـــــ
میں انہیں خوش نہ رکھ سکی ــــــ یہ میرا قصور ہے ـــــ کتنا بیچین
ہے ـــــ ثمر دت ـــــ وہ گھبرا کر چونک پڑیں۔ کیا تم سلمان
کو پسند کرتی ہو ـــــ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ جلدی بتاؤ۔ وہ زور
سے میرا ہاتھ دباتے ہوئے بولیں ـــــ میں ـــــ کیوں ـــــ
نہیں تو ـــــ مجھے ویسی ہی جلن ہونے لگی تھی کہ جیسے صہیب اور
باجی کی شادی نہ ہونے کے ذمہ دار سلمان ہی ہیں۔ مجھے نفرت
سی تھی سلمان سے ـــــ مگر باجی نے ایسا ٹیڑھا سوال کیوں

کیا تھا ـــــ ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں ـــــ مگر جب میں
نے نہیں کہا تھا۔ تو وہ زرد پڑ گئی تھیں اور اس چہرہ ہو گیا تھا ـــــ
ان کا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا تھا ـــــ اور صہیب ـــــ وہ اور بھی
آہستہ سے بولیں ـــــ ہاں وہ اچھے ہیں ـــــ میں نے بغیر
جھجک کے کہدیا تھا ـــــ اس لئے کہ وہ باجی کو پسند تھے، اور
میں بھی اسی لئے پسند کرتی تھی ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔
انہوں نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ کتنی لمبی آہ کے بعد وہ صرف اُف
پروردگار ہی کہہ سکی تھیں۔ کیوں باجی آپ کیوں پوچھ رہی ہیں میں
نے ان کی بڑھتی ہوئی گھبراہٹ سے ڈر کر کہا تھا ـــــ وہ شمع
کو گھورتے ہوئے بڑبڑائی تھیں ـــــ اف ثروت تم نے یہ کیا کہدیا
ـــــ میں چاہتی تھی کہ ـــــ خفا تو نہ ہو گی۔ وہ مسکراتے ہوئے
مجھے دیکھ رہی تھیں ـــــ باجی میں نے بے قرار ہوتے ہوئے کہا
تھا۔ میں آپ کی ہر خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کروں گی ـــــ
وہ زور سے ہنس پڑی تھیں۔ کھوکھلی ہنسی۔ جس کے ساتھ ہی کھانسی
بھی شروع ہو گئی تھی۔ کچھ دیر کھانسنے کے بعد وہ میرا ہاتھ پکڑ کر
منت سے کہہ رہی تھیں۔ ثروت۔ میں بڑی بدنصیب ہوں۔ میں کسی
کی بھی خدمت نہ کر سکی۔ آج میں تم سے سب کچھ کہدوں گی ثروت ...

میں نے صہیب کو رنج پہنچایا ــــ میں نے اس کے دل کو دکھایا۔
پر یہ تو میرا قصور نہ تھا۔ اس کی ذمہ داری امی جانی ــــ بابا جان ــــ
خالہ جان ــــ خیر اب مجھ کو چاہیئے تھا کہ سلمان کی خدمت
کرتی اس کی روح کو اپنی روح نذر کرتی ــــ مگر ثروت ــــ وہ
رو پڑی تھیں، ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ ثروت میں صرف ان کو جسم
پیش کر سکی ــــ ثروت میری روح ان کی شکل دیکھ کر کانپ
جاتی ــــ بھٹکتی پھرتی ــــ رہی۔ اپنے پرانے گھر میں۔ وہ کسی کی
پریشان روح میں سما جانا چاہتی تھی ــــ مگر ــــ رنگین بندھنوں
سے کیسے نکل سکتی تھی ــــ میں نے سلمان کو ابتک فریب دیا۔
مگر وہ بچہ نہیں ــــ اس کے لئے میں عذاب تھی ــــ وہ اپنے ــــ
راہ گذر پر چلتے چلتے مجھے گھسیٹ کر لاکھڑا کرتا ــــ میں بھی مسکراتے
ہوئے اُسے یقین دلاتی کہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ وہ خوشی سے
دیوانہ ہو جاتا تھا ــــ اور جوش میں اپنے گرم گرم ہاتھوں سے میرا ہاتھ
پکڑتا کہ چلو میں بھی مجبوراً بڑھتی ــــ مگر ــــ جب وہ گرم ہاتھ
میرے ان سرد گوشت ہڈیوں کے ڈھانچے کو پکڑتے چلنے کے لئے۔
زندگی کی راہ پر تو ــــ وہ کانپ جاتا۔ مگر میری روح کب کی اُڑتی
ہوئی اس پریشان روح کو ڈھونڈنے ــــ ان پریشان نظروں میں

کھو جاتی تھی ـــــ جو مصر میں آرٹ سیکھ رہی ہیں ـــ ثروت ہیں
نے سلمان کو دھوکا دیا ـــــ مجھے اس کا احساس ـــ کیا ـــ
کیا تم اپنی بہن کا بدلا اتار سکتی ہو ـــ ثروت ـــــ ان کو خوش
رکھ سکتی ہو ـــ اگر تم ہاں کر دو ـــــ تو ـــ میں ابھی خوشی سے
پاگل ہو جاؤں گی ـــــ اور میری روح ذہنی بوجھ سے ہلکی ہو جائے
گی ـــــ پھر میں شاید اطمینان سے مر سکوں ـــ اور میرے
منہ سے بے اختیار ـــــ ان کی تکلیف سے بے قرار ہو کر ـــــ
نہ جانے کیسے اتنی جلدی ہاں نکل گیا ـــــ ایک سیکنڈ میں۔ اپنی
زندگی کو گروی ڈال دیا تھا ـــــ کتنا غضب ہو گیا تھا ـــــ اس
رات سے اور آج تک میری روح جیسے کسی نے بھینچ ڈالی ہے ـــ
جب کبھی خیال آتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہلکے ہلکے کوئی
میری تازگی کو نچوڑ ڈالتا ہے ـــــ وہ ایک قسم کی خوشی اب کچھ
بجھ سی گئی ہے ـــــ باجی نے کتنا ظلم کیا مجھ پر ـــ کیا پتہ میں
بھی کسی کو خوش رکھ سکوں ـــــ یا ـــــ جب یہ سوچتی ہوں تو
باجی کی شکل سامنے پھرنے لگتی ہے ـــــ میرے ہاں کرنے پر وہ
بے اختیار اٹھ بیٹھی تھیں۔ اور مجھے اپنی ساری قوت سے بھینچ ڈالا تھا۔
مگر پھر ثروت کہہ کر مجھے گلے لگا کر رونے لگی تھیں ـــــ آنسو تھمتے ہی

نہ تھے ـــــ پھر تصویر کی طرف دیکھ کر کہا تھا ـــــ ثروت میری پیاری
بچی۔ میں تمہارا احسان اس دنیا میں کبھی نہ بھولوں گی ـــــ یہ تصویر صہیب
کو دینا ـــــ اور کہنا ـــــ کہ موت کا دروازہ تو میں نے ـــــ دو سال پہلے
ہی دیکھ لیا تھا ـــــ تم جاتے ہوئے راہ بتا گئے تھے ـــــ میں اسی راہ
چلی گئی ـــــ کہنا کہ ـــــ وہ پھر کھانسنے لگی تھیں ـــــ کہنا ثروت۔ میں
نے اپنا راستہ نہیں بدلا ـــــ میں چلتی ہی گئی ـــــ اس راہ کو میں نے
بہت جلد چھوڑ دیا ـــــ جہاں سلمان کھڑے چلا رہے تھے ـــــ وہ مجھے
پکڑنا چاہ رہے تھے ـــــ مگر میری روح کی بلندی تک وہ نہ پہنچ سکے ـــــ
بس تمہاری بتائی ہوئی راہ پر چلتی گئی۔ امی نے آوازیں دیں۔ کہا دودھ نہ
بخشوں گی۔ بابا جان نے سمجھایا ـــــ مگر صہیب میں نے اپنی راہ نہ چھوڑی
موت کے قدموں کے نشان پہ اپنے قدم رکھتی ہوئی آخر اس کے دروازے
تک پہنچ ہی گئی تھی ـــــ دو سال پہلے ـــــ مگر صہیب تم پورے پانچ
سال بعد آنے کا وعدہ کر گئے تھے۔ بڑی مشکل سے اتنے دن انتظار کر سکی
ـــــ ابھی کچھ دن باقی ہیں صہیب اب موت کا دروازہ کھلنے والا
ہے ـــــ اب میں انتظار نہیں کر سکتی ـــــ مگر میری روح ضرور
انتظار کرے گی ـــــ کاش میں ـــــ تم کو ایک بار ـــــ صرف ایکبار
مرنے سے پہلے دیکھ سکتی ـــــ میری روح شدت سے تمہارا انتظار

کرے گی ــــ اس کی گواہی میری بنائی ہوئی یہ تصویر ہے ــ
تم ــــ آزما لینا ــــ ان کو بخار بے حد تیز ہو گیا تھا ــــ
روتے روتے آنکھیں سوجھ گئی تھیں ــــ پانی ــــ انہوں نے
آہستہ سے پانی مانگا تھا' ان کا سانس بگڑ گیا تھا . . . . . اور جب میں
پانی لے کر امی جان کو آواز دیتی ہوئی ان کے کمرے میں بھاگتی ہوئی گئی
تھی ــــ تو ــــ میری پیاری باجی آزاد ہو چکی تھیں ــــ وہ ہم
سب کو روتا چھوڑ کر ــــ موت کا دروازہ کھلتے ہی اندر گھس گئی تھیں'
باجی ــــ میری جہانوں ــــ باجی ــــ مگر کتنا ظلم کیا مجھ پر ــــ
خود آزاد ہو گئیں ــــ اور ــــ مجھے گروی کر دیا ــــ زندگی اتنی
مشکل نہیں ــــ جتنا کسی کا دل بہلانا ــــ آج بھی ایسی ہی اداس شام
ہے۔ کاش میری روح بھی میرے اس بوجھل جسم سے نکل سکے ــــ
صہیب کے آنے سے پہلے ــــ میں کیسے بتاؤں گی ــــ کیسے ان کی
بنائی ہوئی یہ تصویر دوں گی۔ جب وہ سفر سے تھکے ہوئے اسی پلنگ پر بیٹھیں
گے اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے نیچی نظریں کئے ہوئے مجھ سے پوچھیں گے
کہ ــــ ثروت ــــ جہانوں کہاں ہے ــــ تو ــــ اس وقت ــ
میں کس منہ سے کہوں گی ــــ ہاں ــــ یہ تصویر ان کے سوال کا
جواب دے گی ــــ یہ گہری سیاہ شام ــــ یہ گہری سیاہی میں ڈوبا

ہوا آسمان دور اُفق میں جہاں ہلکے سے سرخ۔ زرد اور سیاہ رنگ کی چادر اوڑھے سورج کب کا بے خبر سو گیا تھا ـــــ چند پتھروں کے ڈھیر کے پاس ایک سیاہ سے گڑھے میں پڑی ہوئی انسانی کھوپڑی جسکے صرف آنکھوں کے دو گڑھے۔ ناک کے دو ننھے ننھے چھید اور دہلانے کا ہیبت ناک گڑھا ـــــ آنکھوں کے نشان میں سے دو خشک ٹہنیاں جو سیاہی میں کھو گئیں تھیں ان کے سروں پہ زرد چمپا کے پھول کھلے ہوئے تھے ـــــ اس تصویر کے نیچے باجی نے ـــــ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لکھا تھا ـــــ انتظار ـــــ اور وہی غالب کا شعر ؎

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

میری روح جیسے کسی نے جھنجھوڑ ڈالی۔ سردی سے سارا جسم کانپنے لگا۔ کمرے میں اندھیرا گھپ ہو گیا تھا ـــــ باہر بڑی سخت بارش ہو رہی تھی ـــــ صہیب بھیا کے اس اندھیرے کمرے میں مجھے ڈر لگنے لگا۔

ـــــ میرے آنسو بے اختیار نکل پڑے ہیں۔ میں یہی سوچ رہی ہوں کہ کیسے صہیب کو بتاؤں گی ـــــ اور یہ کہ میں گردی ہو چکی ہوں ـــــ یہ سب کیوں ہوا ـــــ مجھے باجی پر غصہ آنے لگا ہے۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے باجی میرے سینے سے لپٹی ہوئی سسکیاں بھر رہی ہیں۔

میری ثروت — میرا آخری کام کر دینا — کل صہیب آئیں گے —
میں — میری روح تمہارا احسان اس دنیا میں بھی نہ بھولے گی —
میں گھبرا کر کمرہ چھوڑ کر بھاگ آنا چاہتی ہوں — مگر مجھے ایسا محسوس ہو رہا
ہے۔ جیسے باجی میرے پیچھے بھاگتی ہوئی آ رہی ہیں۔ جیسے اس کمرے میں
باجی کی روح — آہستہ آہستہ پھر رہی ہے — پردوں سے گلے
ملتی ہوئی۔ اس کمرے میں رہنے والے کے جذبۂ محبت سے — وہ
مجھے جھنجھوڑ رہی ہیں۔ کل صہیب آ رہے ہیں۔ میری تصویر ضرور دینا۔ میری
روح تمہارا احسان کبھی نہ بھولے گی۔ یکایک ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے
جسم کی خوشبو سے میرا دماغ پھٹا جاتا ہے اور باجی مجھے بھینچے ڈال رہی ہیں۔ میرا
دم گھٹنے لگا — میرے ہاتھ سے جھاڑن اور تصویر زمین پر گر پڑی —
ایک تیز ہوا کا جھونکا آیا اور کھلے ہوئے سڑک کے دروازے بھی ایک دھماکے
کے ساتھ بند ہو گئے — اور میں نے دیکھا کہ اندھیرے میں باجی تصویر
کو سینے سے لگائے کھڑی ہیں۔ مجھے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔